برقرار
احمد کمال پروازی

# برقرار

احمد کمال پروازی

نام کتاب : برقرار (دوسرا شعری مجموعہ)
شاعر : احمد کمالؔ پروازی
پتہ : نزد مالوہ اسٹیل فیکٹری، توپ خانہ روڈ اجین۔ مدھیہ پردیش (انڈیا)
پن کوڈ۔ 456001
تعداد : ۵۰۰
قیمت : ۲۵۰؍روپے
سال : باراول۔ ۲۰۰۵ء
سرورق : عبدالحمید گوہر
کمپوزنگ : گوہر گرافکس، انڈا گلی اوجین
مطبع : گوہر گرافکس، انڈا گلی اوجین، موبائل 9302220342

**تقسیم کار،،**

- ایم۔آر۔ پبلی کیشن 2652/55 فرسٹ فلور کوچہ چیلان دریا گنج نئی دہلی، (110002)
Cell. No. 9810784549
- گوہر گرافکس، انڈا گلی اجین، ایم، پی، پن کوڈ، 456006
Cell. No. 9302220342

# انتساب

اپنے والدِ بزرگ مرحوم فرحت حسین صاحب

کے نام

جن کی خاموشی مجھے آج بھی سنائی دیتی ہے۔

احمد کمال پروازی

# مختلف کے بعد....

مختلف ،، میرا پہلا غزلوں پر مشتمل۔ شعری مجموعہ 1988 میں منظر عام پر آیا۔ اور اب یہ (برقرار) دوسرا مجموعہ ہے۔ وقت کی یہ درمیانی مدت واقعی ایک طویل مدت ہے۔ جسکا مجھے شدت سے احساس ہے۔ بہر حال یہ میرے کرم فرماؤں کے مسلسل تقاضوں کا ہی نتیجہ ہے۔ مختلف کو جس قدر پزیرائی حاصل ہوئی وہ میری توقع سے کہیں زیادہ تھی۔ چونکہ مختلف کا استعارہ مروجہ فکری ولسانی محاورے سے قدرے بدلا ہوا تھا۔ اس لیئے فیشن کے اس پس منظر میں اس پر خصوصی توجہ کے امکانات کم سے کم تھے۔ لیکن میرا اندیشہ غلط نکلا۔

برقرار میرے تیئں مختلف سے ان معنوں میں الگ ہوجاتا ہے کہ اس میں ترجیحات بہت حد تک متنوع ہیں ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئیں ہیں۔ یعنی جہاں میں نہیں ہوں وہاں بھی میں ہوں۔ میں نے شعر کو اس وقت تک قطعی شکل میں قبول نہیں کیا جب تک وہ انفرادی ہوتے ہوئے بھی اجتماعی تجربے کی جمالیات سے بہرہ ور نہیں ہوا مثلاً یہ شعر۔

،، مجھے بتلاؤ کعبہ کس طرف ہے۔ میں حجرہ چھوڑ کے چکرا گیا ہوں ،،

میری ابتدائی ذہنی تربیت میں مقامی سطح پر میرے بڑے بھائی اقبال واقف صاحب اور ضمیر القادری صاحب کے نام آتے ہیں۔ اسکے علاوہ وسع تر سیاق میں ڈاکٹر عتیق اللہ کا نام بہت محترم و معتبر حیثیت رکھتا ہے۔ اس کتاب میں جہاں تک مفید مشوروں کا تعلق ہے عزیزم عبدالحمید گوہر کا میں شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اِس ترکیب پر زور دیا کہ دوسری کتاب میں پہلی

کتاب سے متعلق وہ تاثرات جو کہ مضامین وتبصروں کی شکل میں ہیں اور جو اہم صاحب نقد ونظر شخصیات کی بصیرت کا حوالہ ہیں، انہیں اس طرح شامل کیا جائے کہ وہ ایک باالکل نئی ترکیب وترتیب میں ڈھل جائیں۔ کیونکہ کتاب وہ خود اپنے کمپیوٹر پر کمپوز کرر ہے تھے اس لئے بلاشبہ انہوں نے بڑی دیدہ ریزی سے اسے انجام تک پہنچایا۔

احمد کمالؔ پروازی

ہم اپنا کام کرتے ہی چلے جائیں گے محفل سے
پھر اس کے بعد اردو کی حفاظت تم کو کرنا ہے
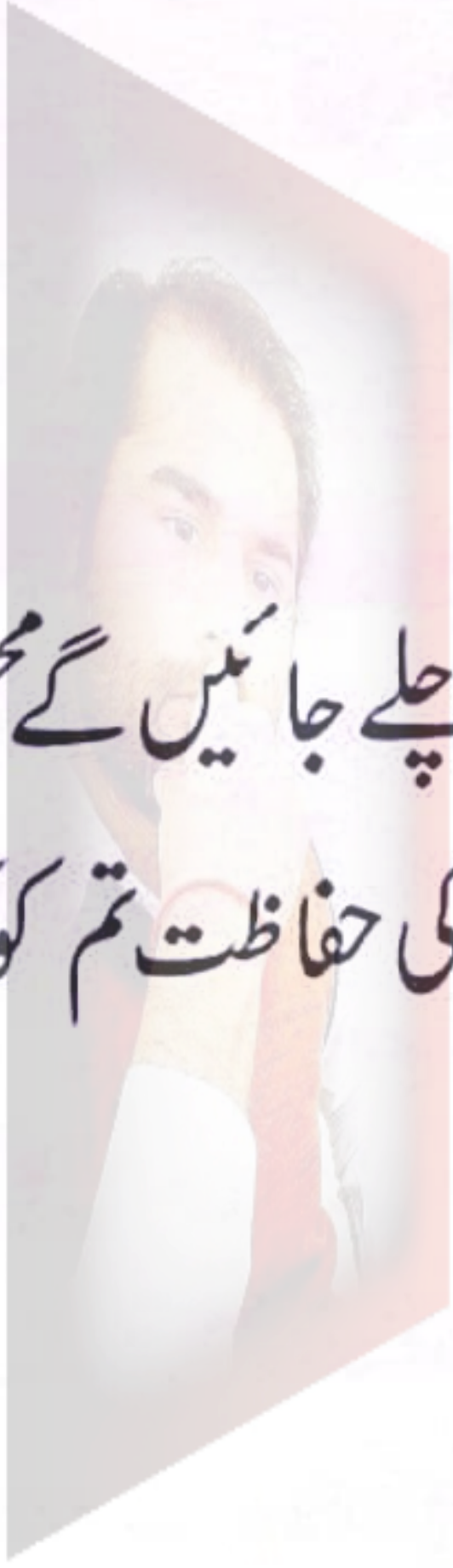
میں جب بھی شعر کا فن اختیار کرتا ہوں
تو تیرے نام سے پرور دگار کرتا ہوں

نماز پڑھ کے جبیں استوار کرتا ہوں
میں ایک تیر سے دو دو شکار کرتا ہوں

کبھی اذان کی صورت مجھے سنائی دے
میں روزہ رکھ کے ترا انتظار کرتا ہوں

الٰہی تو میرے محبوب کا بھی خالق ہے
میں اس لیئے بھی ترا اعتبار کرتا ہوں

خدایا ان سے محبت کا حق مجھے دینا
میں ایسے کام بہت شاندار کرتا ہوں

احمد کمال کے یہاں ماضی کی طرف مراجعت کا بھی ایک میلان نمایاں ہے
اس میلان کو نو رومانیت کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔۔ پروفیسر عتیق اللہ۔ دہلی

بس ایک رات کرشمے کی انتہا ہو جا
لہو میں گھل کے مدینہ منورہ ہو جا

جبیں پہ کالے نشانات کا بھرم رکھ لے
تجھے جہاز کا صدقہ قطب نما ہو جا

نئے سفر نئے کاغذ پہ دستخط کر دے
تمام پچھلے حسابوں سے ماورا ہو جا

یہاں عذاب کی باریکی کون دیکھے گا
اے رسم خاص میرے سامنے ادا ہو جا

میں بے وفائی کو منشائے حق سمجھتا ہوں
تجھے تو یہ بھی سہولت ہے بے وفا ہو جا



سچ کا اپنا ایک انوکھا پن ہوتا ہے، جو کبھی کبھی جھوٹ سے زیادہ حیران کن اور جھوٹ سے زیادہ جھوٹ کا تاثر فراہم کرتا ہے۔

پروفیسر عتیق اللہ۔ دہلی

میں اب اتنا مہذّب ہو گیا ہوں
دو زانو ہو کے صورت دیکھتا ہوں

مجھے بتلاؤ کعبہ کس طرف ہے
میں حُجرہ چھوڑ کر چکرا گیا ہوں

کہاں ہو تُم مرے ہجرت گزیدو
چلے آؤ میں جھولا کھولتا ہوں

یہ بستی ایک دشتِ کربلا ہے
ٹُھہر جاؤ میں پانی لا رہا ہوں

اُلجھ کے تیری آتش بازیوں میں
میں اپنے قد سے آگے آگیا ہوں



احمد کمالؔ پروازی کی شاعری زندگی کے نشیب و فراز، تلخ و ترش، تجربوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے
یہ درد و سوز کی ایسی دولت ہے جو ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی
پروفیسر عظیم الشان صدیقی

حرف سے بن گئے جبینوں پر
اتنا رگڑا ہے سر زمینوں پر

اِن کو فنکاری مت عطا کرنا
رحم کر میرے جانشینوں پر

جانے کس کس کی لین داری ہے
اِن دریدہ سی آستینوں پر

کچھ پرندوں کے سر پہ سائے ہیں
کچھ بھروسہ ہے آبگینوں پر



جن کا سینہ کشادہ ہوتا ہے اور وہ خود زندگی کو امانت تصور کرتے ہیں تب ہی وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آج تک تیرا تسلسل کبھی ٹوٹا ہی نہیں۔ کیسا پتھر ہے کہ سینے سے سرکتا ہی نہیں،،

پروفیسر عظیم الشان صدیقی

ہماری تشنہ لبی آج بھی نقاب میں ہے
مگر وہ نہر کا پانی بڑے عذاب میں ہے

کوئی بھی چیز تڑپنے کے فن سے آتی ہے
یہ زلزلہ بھی مری بات کے جواب میں ہے

اندھیرے غم کی کوئی شام کم نہیں ہوگی
تمہاری آنکھ کا کاجل مرے حساب میں ہے

زرا سی ناؤ نے دریا سنبھال رکھا ہے
تمہارے بعد بھی اِک پنکھڑی گلاب میں ہے

اندھیرے وقت میں تو بھی چراغ کیا دیتا
ترا پتہ بھی مری گمشدہ کتاب میں ہے

احمد کمال پروازی ایک ذہین، حساس، اور اوریجنل شاعر ہیں۔

عبدالاحد ساز بمبئی۔

میں چاہتا ہوں سُبک گام اطمینان سے آئے
تری خبر بھی گلابوں کے درمیان سے آئے

میں جب بھی جاگوں تو جاگوں ترے حوالے سے
سویرا آئے تو ہو کر ترے مکان سے آئے

طلب تو یہ کہ تجارت کروں ستاروں سے
حساب لینے کوئی چاند آسمان سے آئے

مرا خیال ترے حُسن کے جواز میں ہو
اور اِس خیال کی تصدیق زعفران سے آئے

میں ترے ہجر میں اِک ایسا زخم بن جاؤں
کی تیری خوشبو مری چوٹ کے نشان سے آئے



مجموعے میں دیہی معاشرت کی پیوندکاری اسکے تنوع میں اضافے کا سبب بن جاتی ہے۔
پروفیسر عظیم الشان صدیقی دہلی،

اِک ادنیٰ سی گزارش ہے مرا یہ بوجھ اُترا دے
ترا کیا قد و قامت ہے ذرا سا ہاتھ لگوا دے

میں دشتِ آرزو سے ایک آنسو کھینچ لایا ہوں
یہ جگنو معتبر کر دے اِسی قطرے کو پھیلا دے

تجھے معلوم ہے مہتاب کس خانے میں رکھا ہے
مری قسمت کا تارا بھی اُسی خانے میں سرکا دے

بہت محتاط ہوں لیکن یہ رسمِ الوداعی ہے
میں قابو کھو بھی سکتا ہوں مجھے زنجیر پہنا دے

خدایا اُنکی نسبت سے میں ساری رات جاگا ہوں
مگر اِسکی گواہی کے لئے اک چاند پہنچا دے

ایک حساس انسان کی طرح وہ محض تماشائی بن کر نہیں رہ جاتے بلکہ اپنے عہد
اور اس کی ناانصافیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں
پروفیسر عظیم الشان صدیقی دہلی

پھٹی چادر سے لہجہ بن رہا ہے
یہ کوئی دکھ نہیں ہے تجربہ ہے

سراسر یہ ہمارا مسئلہ ہے
خُدا کو تو خُدا کا آسرا ہے

پُرانی سب فریمیں دم بخُود ہیں
مُحل کا نام بدلا جا رہا ہے

تڑپ جاؤں مگر پانی نہ مانگوں
یہ خاصہ بھی مرے اُسلوب کا ہے

ہمیں کہنی کے بل چلنا پڑے گا
اگر لہجے سے لہجہ کاٹتا ہے



کمال نے ذات کو کم ہی مسئلہ بنایا ہے، اسے تو اپنی انا کو بسیط آفاق میں پھیلانے میں طمانت حاصل ہوتی ہے۔

پروفیسر عتیق اللہ۔ دہلی

تجھ سے بچھڑوں تو تیری ذات کا حصہ ہو جاؤں
جس سے مرتا ہوں اسی زہر سے اچھا ہو جاؤں

تم مرے ساتھ ہو یہ سچ تو نہیں ہے لیکن
میں اگر جھوٹ نہ بولوں تو اکیلا ہو جاؤں

میں تری قید کو تسلیم تو کرتا ہوں مگر
یہ مرے بس میں نہیں ہے کہ پرندہ ہو جاؤں

آدمی بن کے بھٹکنے میں مزا آتا ہے
میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ فرشتہ ہو جاؤں

وہ تو اندر کی اداسی نے بچایا ورنہ
انکی مرضی تو یہی تھی کہ شگفتہ ہو جاؤں

ان اشعار کا خالق کوئی معمولی تخلیق کار نہیں ہو سکتا ۔ عبدالمتین نیاز

کسی نے پردے کے پیچھے سے رہنمائی کی
میں جب بھی اُلجھا ہوں اُس نے گرہ کشائی کی

برائے روشنی پہلے بجھا دیئے تھے چراغ
پھر اُسکے بعد ادا رسم رونمائی کی

ترے خلاف گواہی تو دے رہا ہوں مگر
دعائیں مانگ رہا ہوں تری رہائی کی

اُداس رہنے کی خواہش بھی ہو گئی پوری
بہت دنوں سے تمنّا تھی بے وفائی کی

مآل یہ کہ ترے شہرِ بے وفا میں کوئی
رسید لے کے بھٹکتا ہے آشنائی کی



کمال ہمارے ان محدود ترین شعراء میں سے ایک ہیں جنھوں نے فطرت کے تلازمات اور متعلقات کو رسمی طور پر اخذ نہیں کیا بلکہ دیہات ان کا ذاتی تجربہ ہے۔

پروفیسر عتیق اللہ۔ دہلی

بے داغ تمنا ہو عقیدہ بھی کھرا ہو
جب کوئی سفر پانو کی جنبش سے بڑا ہو

یہ عدلِ جہاں گیر کی بنیاد تو دیکھو
جیسے کسی دیوار پہ الزام رکھا ہو

کیا وہ بھی تہہِ تیغ کیا جائے کہ جس نے
کچھ اور نہیں صرف گریبان سیا ہو

جس پہر ہر اِک در سے نکلتے ہیں شکاری
ایسا تو نہیں یہ بھی وہی آب و ہوا ہو

اب جبکہ سبھی سُورما موجود ہیں گھر میں
ہو سکتا ہے وہ رَن میں اکیلا ہی گیا ہو

فکروفن کے تقاضوں کے مطابق اس نے اپنی ایک الگ راہ بنانے کی سعی کی۔شعر کے پہلے مصرعے میں خلق کی ہوئی دقیق فضا کو دوسرے مصرعے یا کسی ایک لفظ کے ذریعے تہس نہس بھی کر دیتی ہے۔

پروفیسر عتیق اللہ۔دہلی

طوق کو تخت کا حامل بھی ضروری سمجھو
سانس روکی ہے تو حاصل بھی ضروری سمجھو

شہ سواری کو زمینیں تو پرکھ لی جائیں
گرد اُڑانے کے مسائل بھی ضروری سمجھو

خوف بھی منزلِ مقصود پہ لے جاتا ہے
پیچھے آتا ہوا قاتل بھی ضروری سمجھو

ایک سے دوسرا منظر بھی اُکھڑ جاتا ہے
پیڑ کو سائے کا حامل بھی ضروری سمجھو

نقش تاریک بھی تسلیم کرالیتا ہے
صاف چہرہ ہے تو اک تِل بھی ضروری سمجھو

شاعری کی مروجہ ساخت سے الگ ہونے کا حوصلہ ہر ایک میں نہیں ہوتا
مصور سبزواری ایوان اردو۔ دہلی

پتھر سے اپنا ہاتھ نکالا نہیں گیا
ایسا دبا کہ مُنہ میں نوالا نہیں گیا

انجام یہ کہ اپنے ہی خنجر سے کٹ گئے
بچپن تھا احتجاج سنبھالا نہیں گیا

منظر تو خوش مذاق تھا لیکن تہہِ مذاق
وہ چوٹ تھی کہ ہوش سنبھالا نہیں گیا

اِک چاند دسترس سے نکل تو گیا مگر
ہاتھوں کی انگلیوں سے اُجالا نہیں گیا

دیکھا تو جیسے باپ کی تصویر ہو بہو
دینا پڑا فقیر تھا، ٹالا نہیں گیا

کارزار حیات میں شعوری پسپائی اگرچہ کوئی معیوب فعل نہیں لیکن شعور و آگہی کے منظرنامے میں ابہام کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ پروفیسر عظیم الشان صدیقی دہلی،

روشنی سانس ہی لے لے تو ٹھہر جاتا ہوں
ایک جگنو بھی چمک جائے تو ڈر جاتا ہوں

میری عادت مجھے پاگل نہیں ہونے دیتی
لوگ تو اب بھی سمجھتے ہیں کہ گھر جاتا ہوں

میں نے اِس شہر میں وہ ٹھوکریں کھائی ہیں کہ اب
آنکھ بھی موند کے گزروں تو گزر جاتا ہوں

اِس لئے بھی مرا اعزاز پہ حق بنتا ہے
سر جھکائے ہوئے جاتا ہوں جدھر جاتا ہوں

اِس قدر آپکے بدلے ہوئے تیور ہیں کہ میں
اپنی ہی چیز اُٹھاتے ہوئے ڈر جاتا ہوں



اِنکی شاعری اپنی پیشِ رونسل کی کورانہ تقلید کے بجائے زمین اور زندگی کے کھرے تجربات سے عبارت ہے۔ ڈاکٹر صادق۔ دلّی یونیورسٹی۔

تم تو میری بتّیاں روشن کرو
میں تمہارا شہر ہوں دانش ورو

خنجروں کی دھار جیسے لوگ ہیں
یہ جگہ اچھّی ہے خیمے گاڑ دو

روشنی تو سب گھروں میں عام ہے
تم ہمارے گھر کے روشن دان ہو

اِس جگہ کے پیڑ بھی حسّاس ہیں
اپنے پانو اور آہستہ رکھو

میں تو تم سے بھی لپٹ کر روؤں گا
کون کہتا ہے کہ تم اِک پیڑ ہو

کالے پانی کا سمندر ہوں مجھے
ساحلوں پہ بیٹھ کر دیکھا کرو

اسکی شاعری میں آنے والی نسل کے مستقبل کی تعمیر کے حسین خواب پوشیدہ ہیں۔
ڈاکٹر صادق۔ دلّی یونیورسٹی۔

یاروں کی گلی چھوڑ کے آنا نہیں آیا
پھر قتل ہوئے جان بچانا نہیں آیا

بے چینیٔ شب میں کبھی کروٹ نہیں بدلی
اپنے لئے اوروں کو جگانا نہیں آیا

ایمان کے اثرات سے باہر نہیں آئے
تصویر سے تصویر بنانا نہیں آیا

پھر بعد میں رہ جائے گی اک خالی ہتھیلی
بروقت اگر ہاتھ ملانا نہیں آیا

اب بھی مرے ہاتھوں سے نکل جاتی ہیں چیزیں
اب بھی تری دہلیز تک جانا نہیں آیا

مسرت ہے کے شاعری کے داخلی اور خارجی مطالبات سے نبرد آزمائی کے لئے پروازی نے بہت جلد ایک وسیع اور قابلِ قبول تناظر فراہم کر لیا ہے۔ مصور سبزواری ایوان اردو۔ دہلی

شام سے ہنسنے ہنسانے میں اُلجھ جاتا ہوں
غم کو تفریح کرانے میں اُلجھ جاتا ہوں

کہہ تو دیتا ہوں یہاں لوگ مرے اپنے ہیں
بعد میں نام بتانے میں اُلجھ جاتا ہوں

دیر ہو جاتی ہے ہر کوچے میں رکھنے سے چراغ
عزّتِ شہر بچانے میں اُلجھ جاتا ہوں

اب کرم ہو تو مرے قد کے برابر یا رب
آدمی ہوں میں چھپانے میں اُلجھ جاتا ہوں

تیری تعریف اسی بات میں گُم ہے شاید
تیری تفصیل بتانے میں اُلجھ جاتا ہے

انکی شاعری اپنی پیش رو نسل کی کورانہ تقلید کے بجائے زمین اور زندگی کے کھرے تجربات عبارت ہے۔ڈاکٹر صادق۔دلّی یونیورسٹی۔

شب رہے یا دن نکل آئے مگر ہونا تو ہے
جانبِ آواز اک اندھا سفر ہونا تو ہے

خوب ہے رختِ سفر تیاریاں قابومیں ہیں
بس ذرا سا دل دکھا دو در بدر ہونا تو ہے

بس "فقیرو" اب درِ جاناں بہت نزدیک ہے
ایک حملہ اور دامن چیر کر ہونا تو ہے

سر اُٹھا کر کیوں نہ اسکی استِطاعت دیکھ لیں
یہ اندھیرا اب کسی میزان پر ہونا تو ہے

شاعری کی سطح پر جو صبح کا ہم وزن ہے
ایک دن اِس قافیے سے بہرہ ور ہونا تو ہے

ادب اور سماج میں احتجاج اگر چہ مثبت اقدار کی طرف سفر کی پہلی منزل ہے لیکن ہر سفر اپنی سمت و رفتار کا بھی مطالبہ کرتا ہے۔ کبھی کبھی خوف و دہشت کی شدید فضا کی وجہ سے خود کو ابہام کے قالب میں ڈھال لیتا ہے۔
لیکن اسکی روح اور حریت پسندی کبھی مجروح نہیں ہوتی۔ احمد کمال کے احتجاجی لب و لہجے میں یہ روح کارفرما ہے۔

پروفیسر عظیم الشان صدیقی دہلی،

اگر نہ جاؤں تو پانی سسکتا رہتا ہے
مرے بغیر سمندر بھٹکتا رہتا ہے

اے شب گزیدو کبھی بے قرار مت ہونا
تمہارا دل مرے دل میں دھڑکتا رہتا ہے

غریبِ شہر اُسی پر اساس رکھتے ہیں
وہ ایک دن جو کئی دن چمکتا رہتا ہے

یہ واقعہ ہے بڑا ذمّے دار پاگل ہے
اکیلا شہر میں دشنام بکتا رہتا ہے

مگر وہ آج بھی ٹوٹے ہوئے کھلونے میں
نہ جانے کون سے آثار تکتا رہتا ہے

ملک کے اِس بے حجاب دور کو شاعر نے الگ الگ نظریے سے دیکھا ہے۔ اور اپنی تمام بے چینی اور بے بسی نہایت چھوٹی سی بحر میں سلیس انداز سے بیان کر دیا ہے۔

سُبھاش گوڑ

تمہارے شہر میں رہ کر کمال کیسے کریں
ہم اپنی جامہ پزیری بحال کیسے کریں

بس ایک شام ملی ہے رفوگری کیلئے
اب اتنی دیر میں سب کا خیال کیسے کریں

جو کہہ چکے ہیں اُسی کا حساب باقی ہے
ہمیں یہ حق ہی نہیں ہے سوال کیسے کریں

وہ جب گئے تھے تو دیوار بھی تو ٹوٹی تھی
اب آگئے تو اُنہیں حسبِ حال کیسے کریں

تم اِس سفر میں اکیلے نہیں رہو گے کبھی
یہ سوچنا ہے اگر پائمال کیسے کریں



سرزمینِ اجین کے صاحبِ طرز شاعر احمد کمال پروازی نے اپنی شعری وادبی کاوشوں سے بَرِّصغیر کے شعری حوالوں میں اس خطّے کی شناخت قائم کر کے اپنی فکری وفنّی صلاحیتوں کا ثبوت دیا ہے۔

ڈاکٹر واجد قریشی ۔صدر شعبۂ اُردو کالیداس گورنمینٹ کالج اجّین،

ساحلوں کی نفی نہ ہو جاؤں
ڈوب کر سنسنی نہ ہو جاؤں

کُھل رہا ہے محاذ اندر کا
معرکہ آخری نہ ہو جاؤں

رنجشیں کیسے چھوڑ سکتا ہوں
شہر میں اجنبی نہ ہو جاؤں

کوئی میرا مزاج پوچھ نہ لے
پاگلوں کی ہنسی نہ ہو جاؤں

اِک عجب دُھن ہے پاسبانی کی
تیری دیوار ہی نہ ہو جاؤں

تھوڑا صبر و سکون بھی یارب
اِس طرح آدمی نہ ہو جاؤں



احمد کمال پروازی ایک باشعور اور حساس فنکار ہیں، وہ اپنے گرد و پیش میں رونما ہونے والے واقعات و حادثات سے بے خبر نہیں رہتے۔ سیاسی سماجی مسائل کو انہوں نے اپنی غزل میں بڑی خوبصورتی سے سمولیا ہے۔ انکے اشعار میں درد واثر اور فکر کی تہہ داری پائی جاتی ہے ،، احتشام اختر کوٹہ

گھر کے درو دیوار کا شر دیکھتے رہنا
جس سمت محافظ ہوں اُدھر دیکھتے رہنا

خیموں کے تناسب سے ہوا تیز بہت ہے
انجام تو ظاہر ہے مگر دیکھتے رہنا

محلوں کی کنیزیں تو کبھی اُف نہ کریں گی
اِس بات کا لشکر پہ اثر دیکھتے رہنا

اِس دشت میں پانی کی ضرورت کے برابر
پلڑے پہ تراشا ہوا سر دیکھتے رہنا

امکان بھی خالی نہیں ہوتا ہے کشش سے
ڈھل جائے بھی سورج تو اُدھر دیکھتے رہنا



احمد کمالؔ پروازی کی عصری حسیت اور شعور بھی خود کو زمانے کے تقاضوں سے محروم نہیں رکھتا ،
انکے یہاں بھی کہیں کہیں حسین چہرے ابھر کر زندگی کا ثبوت فراہم کرتے رہتے ہیں
یادوں کی چاندنی زندگی کے زخموں کے لئے مرہم بن جاتی ہے۔ پروفیسر عظیم الشان صدیقی دہلی

آ گئے سب میرے انجام پہ آنے والے
اب بتا خواب کی تعبیر بتانے والے

راکھ ہی راکھ ہے جینے کی تمنا کے سوا
کتنے مشتاق ہیں یہ آگ بجھانے والے

راس آجاتی ہے تنہائی کو اس شہر کی خاک
ہو مبارک تجھے گھر چھوڑ کے آنے والے

تجھ سے ملنے ترے آنے کی دعا پڑھنا ہے
جانے کب آئیں گے قندیل جلانے والے

اب اگر گھر سے نکلنا ہے تو اُڑ کر جانا
اتنے اچھے نہیں ہوتے ہیں زمانے والے



مجھے کہنے دیجئے کہ یہ اختلاف کہیں ٹیڑھ سے جا ملتا ہے، تو کہیں گھاؤ سے یا یہ کہیئے کہ اپنی بات کو چیزِ دیگر بنا کر پیش کرنے کا اسے ایک ہنر ہاتھ لگ گیا ہے۔
پروفیسر عتیق اللہ۔ دہلی،

سورج کی سفارش تھی بیابان میں کس تھا
لنگڑاتے ہوئے پانو میں تکلیف کا رس تھا

ہم نے کبھی صحرا کی روایت نہیں توڑی
رِسنے کے لئے خون تھا رُکنے کو نفس تھا

جاتا بھی کہاں بھاگ کے اُجڑے ہوئے دل سے
سچ بات تو یہ کہ مرے اندر ہی قفس تھا

ہم آپ کی تفسیر رقم کرنے میں گُم تھے
معلوم نہیں شہرِ اماں تھا کہ قفس تھا

دراصل مرا رُخ سبھی رستوں سے الگ تھا
حالانکہ ترے ہاتھ میں چاندی کا کلس تھا

علامتوں میں ایسا رنگ بھر دیا ہے کہ انکی حرکت پزیری گہرا تاثر چھوڑتی ہے۔

ثبوت قتل اوجھل ہو گیا ہے
جو سچّا تھا وہ پاگل ہو گیا ہے

مرے قصّے کے قصّہ گو بہت تھے
بڑی جلدی مکمّل ہو گیا ہے

اسے کہتے ہیں حُسنِ دستکاری
شجر کاٹا تو صندل ہو گیا ہے

یہی تو ہے شعورِ بے شعوری
دل اپنے آپ بوجھل ہو گیا ہے

یہ جنگل تو شفا خانہ تھا پہلے
اب آیا ہوں تو مقتل ہو گیا ہے



غزل کی روایتی urbanity کو سامنے رکھ کر تو یہ بعد ہمیں کئی ایسی حیرتوں سے دو چار کرے گا جو قطعاً ہمارے لیئے ایک نئے تجربے کا حکم رکھتا ہے۔ ۔ پروفیسر عتیق اللہ ۔ دہلی

سہارے پر سہارا دے رہی ہے
وہی اِک چیز جو ٹوٹی ہوئی ہے

ابھی تک صرف سورج ڈھل رہے تھے
مگر یہ شام شامِ واقعی ہے

تقاضہ یہ کہ رُک جائیں یہیں پر
ہوا ایسی کہ پتّھر توڑتی ہے

فضا بھی اب کہاں بے ساختہ ہے
کسی کے پیچھے پیچھے چل رہی ہے

کوئی الزام بھی سر پر نہیں تھا
نہ جانے کیوں یہ گردن جھک رہی ہے

یہاں تک ساعتِ دل چل رہی ہے
پھر اسکے بعد شاید زندگی ہے

''مختلف''نئی اردو غزل کے لئے معیار ساز مجموعہ ہے،۔
پروفیسر علیم اللہ حالیؔ، توازن مالیگاؤں،۔

کوئی حد سے ورا نہیں ہوتا
شرطیہ فائدہ نہیں ہوتا

اس سے میں بے وفائی کر جاتا
وہ اگر بے وفا نہیں ہوتا

حاضری کا جواز مت پوچھو
ہر جگہ قاعدہ نہیں ہوتا

مُشکلوں میں شریک رہتا ہے
حسن مشکل کُشا نہیں ہوتا

میرا دل بھی کسان ہے یارب
اس کا قرضہ ادا نہیں ہوتا



آپ کی انفرادیت نمایاں ہے۔ اور کسی شاعر کے لئے یہ بڑی بات ہے انگریزی میں کہا ہے
style is the man۔ یہ اسلوب آپ کا اپنی پہچان ہے
آرڈی شرما تاثیر

اس کا اتنا نشاں بہت ہوگا
آگے پیچھے دھواں بہت ہوگا

ہم تو مٹ کر جواب دیتے ہیں
ایک ہی امتحاں بہت ہوگا

میں ہی مقتول اور قاتل بھی
میرا اپنا بیاں بہت ہوگا

سنگ کٹ کے چمکنے لگتے ہیں
صرف آبِ رواں بہت ہوگا

ایک قطرہ بھی وزن رکھتا ہے
اِس سے کم بھی وہاں بہت ہوگا

کوئے جاناں کی دوڑ تک بھی نہیں
میں نے سمجھا جہاں بہت ہوگا



احمد کمال پروازی شعر گوئی کی باریکی سے واقف ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ دو مصرعوں کا ربط کتنی نزاکت اور باریکی کا کام ہے شاعر نے متعدد اشعار کے ذریعے اردو غزل گوئی میں ایک نئے لہجے کا اضافہ کیا ہے۔

پروفیسر علیم اللہ حالیؔ، تو ازن مالیگاؤں۔

نرم لہجے سے بڑا کام لیا جاتا ہے
اِس سے دشمن کا جگر چاک کیا جاتا ہے

روزِ غم کیا تجھے معلوم نہیں ہے کہ یہاں
شام کو بیٹھ کے آرام کیا جاتا ہے

چوٹ جب ہے کہ کوئی آخری خواہش ہی نہ ہو
بہرِ تعمیل اگر زہر پیا جاتا ہے

کھینچا جاتا ہے ہر اِک جسم سے ریشہ ریشہ
تب کہیں جا کے کوئی زخم سیا جاتا ہے

بے وفا شام ترا نامِ گرامی اب بھی
حاشیہ چھوڑ کے تحریر کیا جاتا ہے

احمد کمال پروازی ایک ذہین، حساس، اور اوریجنل شاعر ہیں۔

عبدالاحد ساز، بمبئی۔

رات کا یاتری نہیں آیا
خالی خالی الاؤ جلتا رہا

بوسے کاغذ طواف کرتی رہی
یہ برس بھی مراسلت میں گیا

خواب کے چاک بھی نہیں سِلتے
کتنا کمزور پڑ گیا دھاگا

سازشیں آج بھوکی بیٹھی ہیں
کوچۂ یار تک بھی مت جانا

زندگی پوری فرض کر لی تھی
یہ نہ سوچا کہ وقت کتنا تھا



میں پہلے کہہ چکا ہوں جس قسم کی غزل کہی جا رہی ہے یہ ہر لحاظ سے اس سے مختلف مختلف غزلوں کا مرقع ہے۔۔آزاد گلاٹی۔نابھ

کبھی بھی آئیں دلداری ابھی ہو
اُنہیں آنے سے پہلے راستہ دو



وہی رفتار دل پر دستکوں سی
مجھے معلوم ہے یہ تم نہیں ہو

ابھی تو رسمِ آمد چل رہی ہے
کہاں جاتے ہو او خانہ بدوش

تیری خواہش ہے اوپر اٹھ رہا ہوں
یہی لمحہ نتیجہ ہو گیا تو

وہی عالم ہے شہرِ زندگی کا
چلو تو دور تک مٹی اڑا دو

''مختلف''، کا شعری لہجہ اور ذائقہ ہم عصر مجموعوں سے مختلف ہے۔
ڈاکٹر محمد حسن عصری ادب دہلی۔

عمر بھر اس طرف دیکھنے سے
اک پرندہ سا آنے لگا ہے

کیسی آواز تھی آدمی کی
چیتھڑے اُڑ گئے پتھروں کے

مدّتوں سے اسی شہر میں ہوں
کر دیا کتنا محدود تم نے

کشتیاں ڈوبنے کے بجائے
اب جزیرہ ابھرنے لگا ہے

اب یہ ہوگا کہ شیشے کے برتن
اُن کے ہاتھوں سے گرنے لگیں گے



احمد کمال پروازی نے اپنے اشعار میں، بیشتر تشبیہات استعارے، تمثیل، پیکر اور علامات فطرت سے اخذ کیئے ہیں۔ اور انہیں سے انکی امیجری تعمیر ہوئی ہے۔

نوشاد احمد کریمی۔ بہار۔

جسم وجاں کا استعارہ ہو گیا
آسماں پر چاند آدھا ہو گیا

آخری خیمہ اُکھڑ جانے کے بعد
نہر کا پانی اکیلا ہو گیا

میرا لہجہ گومتی میں ڈوب کر
لکھنوی تہذیب والا ہو گیا

یہ غریبِ شہر کا اعجاز تھا
پٹّیوں سے زخم اچھا ہو گیا

پھر کوئی کیا رو بروئے غم ہوا
ڈھل گیا سورج اندھیرا ہو گیا

یہ ادا بھی ظلِ سُبحانی کی تھی
شہر کا تبدیل نقشہ ہو گیا



انکے یہاں زبان کی شائستگی اور سلاست بیان کی ساختگی اور شگفتگی، جذبات کی دلکش ترحمانی، تخیل کی بلندی فنی پختگی شعریت و معنویت بدرجہ ءاتم موجود ہے۔

نوشاد احمد کریمی۔ بہار۔

میں جانتا ہوں بہاریں وصول کر لینا
سوال یہ ہے مجھے لوٹنا نہیں آتا

صحیح تو یہ تھا کہ رستے میں خشک ہو جاتا
برا تو یہ ہے کہ دریا میں گر گیا دریا

تمام لوگ ستاروں پہ تصفیہ کر لیں
میں اپنا چاند زمیں کھود کر نکالوں گا

میں ان کو یاد نہ کرنے پہ رہ گیا چپ چاپ
مگر وہاں بھی مجھے اختلاف کرنا تھا

سب اپنی اپنی جگہ پر نڈھال بیٹھے تھے
شراب آئی تو آفاق ہو گیا کمرا

سماجی اور سیاسی واقعات کے بیان میں بھی ان کا لہجہ شاعرانہ بصیرت، جمالیات اور فنی تقاضوں سے بھرپور ہے۔نوشاد احمد کریمی۔ بہار۔

میں کھڑا ہوں یزید خانے میں
یہ قباحت ہے سر جھکانے میں

ہم نے سرکاری آگ دیکھی ہے
عمر کٹ جائیگی بجھانے میں

گھاؤ کی شکل میں نکلتا ہے
چاند برسات کے زمانے میں

میں ہی مقتول اور قاتل بھی
بے وقوفی ہے یہ بتانے میں

میرا کردار تھا محبت کا
پیراہن جل گیا بجھانے میں

رہنما ہے تراش لو تصویر
کام آجائے گی ڈرانے میں



احمد کمال پروازی کا کوئی شعر ان معنوں میں بھی اکہرا نہیں ہوتا کہ اس میں صرف وژن اور فلسفہ انہوں نے غزل کے جس لہجے کو متعارف کیا ہے وہ اس صنف کی زندگی دراز کرنے کی ضمانت دیتا ہے۔

پروفیسر علیم اللہ حالی، تو از ن مالیگاؤں۔

وہ اپنے عمل کی صفائی نہ دے گا
کبھی قیمتِ بے وفائی نہ دے گا

میں خود اسکی عادت پہ حیرت زدہ ہوں
یہ وہ شور ہے جو سنائی نہ دے گا

میرے شہر میں سب ستم یافتہ ہیں
کئے جاؤ کوئی دہائی نہ دے گا

میرے نام کی کیسے تصدیق ہوگی
اگر تو بھی کوئی بُرائی نہ دے گا

میں ہر ایک سے معذرت چاہتا ہوں
مگر آج کوئی دکھائی نہ دے گا



احمد کمال پروازی کی شاعری کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ مواد کی تلاش میں تخیل کی حسین وادیوں میں سفر نہیں کرتے اور نہ ہی رومانیت کے دامن میں پناہ تلاش کرتے۔ پروفیسر عظیم الشان صدیقی دہلی،

ایک سایہ آگے پیچھے جانے انجانے میں ہو
خوش گُمانی چاہیئے وہ چاہے افسانے میں ہو

زندگی سے اس قدر خوش فعلیاں اچھی نہیں
یہ بھی ہو سکتا ہے اس کا ہاتھ دستانے میں ہو

دل کی دھڑکن ایک ایسی بدمزاجی بن گئی ہے
جیسے تیرے بعد ساری عمر حرجانے میں ہو

جنبشِ سر ہر در و دیوار پہ لکھ دی گئی
اور اپنی بے گناہی جیسے تہہ خانے میں ہو

رسمِ سرشاری میں وہ لذّت کہاں سے آئیگی
جو مزہ داری کسی کی خاک اُڑ جانے میں ہو

''مختلف'' کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ احمد کمال پروازی نے کتاب میں خواہ
مخواہ اشعار کی بھیڑ لگانے سے پرہیز کیا ہے
انتخاب کی اس چابکدستی نے یہ فیصلہ مشکل کر دیا ہے کہ کون سا شعر اچھا ہے۔
اور کون سا سب سے اچھا ہے۔نوشاد احمد کریمی۔ بہار۔

اپنی ہی ذات پہ رکھا ہے بھروسہ اپنا
موند کر آنکھ لگاتا ہوں نشانہ اپنا

یہ بھی سچ ہے کہ ہمیں خوفزدہ رکھتا ہے
اجنبی شہر میں بدلا ہوا لہجہ اپنا

اب مرے سر کوئی الزام نہیں آسکتا
دونوں کندھوں پہ مقرر ہے فرشتہ اپنا

وہ تعلق بھی کفایت سے ادا کرتے ہیں
برسرِ طاق ہی رکھتے ہیں اُجالا اپنا

چو طرف اُنکے اُجالا ہے تو حیرت نہ کرو
چاندنی ڈھونڈ ہی لیتی ہے سراپا اپنا

آپ کا کلام پہلے بھی نظر سے گزرتا رہا ہے، اب یکجا دیکھ کر ایک مجموعی تاثر قائم کرنے میں مدد ملی
آپ نے کئی اچھے، زندہ، متحرک، توانا اشعار کی تخلیق کی ہے۔

مظہر امام۔ دہلی

یہ بھی بتاؤ صورتِ صَد چاک کب ہوا
دِل کٹ کے گر گیا تھا مگر خاک کب ہوا



سُنسان پُشت اسپِ طرحدار کب ہوئی
گم ہو گیا سوار یہ اِدراک کب ہوا



اے شہریار پہلے سرِ امتحاں تو آ
تو دُو بدوئے قامتِ سفّاک کب ہوا

دل توڑنے کا فن بھی مہارت کی بات ہے
وہ پوچھتے ہیں گھر خس وخاشاک کب ہوا

غرقاب ہو کے پھر اُسی دریا کی سطح پر
آنا رہینِ منّتِ پیراک کب ہوا

کمال کی شاعری کیول احساس کے اِستر پر ہی نئی نہیں ہے بلکہ اُسکی سوچ وفکر بھی
ایک دم الگ ہے۔ سُبھاش گوڑ

نام لے کر بڑبڑانے کی ہدایت کر گئے
میرے افسانے کے سب کردار ہجرت کر گئے

میں بہت حیران ہوں وہ اِس سے گھبرائے نہیں
جانے کیسے لوگ تھے جو بادشاہت کر گئے

فائدہ کیا ہے کہ اب سوچیں روایاتِ سفر
توڑ کر جانا ضروری تھا کہ عجلت کر گئے

چہرہ پڑھ لینے کی عادت میں بڑے نقصان ہیں
ایسا لگتا ہے کہ جیسے ہم خیانت کر گئے

اِس سے پہلے کہ تعلّق کی نزاکت پوچھتے
اِک پرندہ چھوڑ کر یہ بھی وضاحت کر گئے

شوخی اور شرارت کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی ایک ٹیس کی ہلکی سی لہر بھی
اس میں شامل ہو جاتی ہے۔ ۔ پروفیسر عتیق اللہ ۔ دہلی ،

بند کمرے میں عجب سے قدّ و قامت میں رہا
کچھ دنوں یہ غم پرندوں کی شباہت میں رہا

شخصیت میں دن بہ دن کرتا رہا تبدیلیاں
خشک گملوں میں کبھی مِٹّی کی صورت میں رہا

ماورا غم اور خوشی سے دوسری کیا چیز تھی
کیوں بَری ہو کر بھی سارے دن عدالت میں رہا

اِس سے کیا مطلب کہ کوئی خوف سے روپوش تھا
لطف تو یہ تھا کہ سارا شہر حرکت میں رہا

معرکہ آرائیاں ہوتی رہیں لیکن تمہیں
انتقاماً لکھنے والا ہوں کہ فرصت میں رہا

احمد کمال پروازی نے پوری ذمہ داری، متانتِ فکر، اور متانتِ فن کے ساتھ شاعری کی ہے
وہ آج کی غزل کا بامعنی حوالہ ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ۔ دہلی

اپنی پرچھائیں ڈالتے رہنا
اے درختو سنبھالتے رہنا

پانو کے نیچے پھول رکھ دے گا
زندگی بھر نکالتے رہنا

فکر مت کرنا جاں بچانے کی
عہد نامہ سنبھالتے رہنا

اِس نے دیکھی نہیں ہے تنہائی
آئینو تم سنبھالتے رہنا

نام سے بے وفائی مت کرنا
آگ پہ آگ ڈالتے رہنا



احمد کمال پروازی اسی عہد کے شاعر ہیں اسلئے ان کی عصری حسیت جب ذات کے حوالے سے اپنے دور کی خونچکاں داستاں رقم کرتی ہے تو انکے یہاں بھی درد و غم کی لے تیز ہو جاتی ہے۔

پروفیسر عظیم الشان صدیقی دہلی،

یہ شرط لگا دی کوئی زینہ نہیں اُترے
دیوار پہ دیوار کا سایہ نہیں اُترے

دراصل یہ میری نہیں دریا کی نفی ہے
پانی کے لئے کوئی پرندہ نہیں اُترے

مشکل ہے مگر یہ بھی تو آسان نہیں ہے
دروازے کھلیں اور اُجالا نہیں اُترے

کیا میری طرح تم بھی یہی سوچ رہے ہو
کیوں آج مسافر لبِ دریا نہیں اُترے

یعنی مرے لہجے میں تصنّع نہیں ہوتا
ہو سکتا ہے معیار پہ پورا نہیں اُترے

انکی شاعری کا لہجہ کسی قدر دھیما ضرور ہے لیکن آہنگ بلند ہے۔
جوانہیں دوسرے شعراء سے مختلف بنا دیتا ہے۔ پروفیسر عظیم الشان صدیقی دہلی،

تری سلطنت میں خلل ڈال دیں گے
یہ بچّے پُرانے عدد مانگ لیں گے

نئے زخم جتنے ہیں محفوظ کر لو
یہ رِسنے لگے تو بہت کام دیں گے

یہی چاند کل آگے آگے چلے گا
ستارے بھی اب ٹہنیوں پر ملیں گے

یہ منہ زور دشت و جبل کم ہوئے تو
ترے واسطے آسماں کھول دیں گے

وہ نیلم پری کس طرح جھولتی ہے
چلو دادی ماں سے کہانی سنیں گے



,,مختلف ,, کے شاعر کے ردِ عمل میں انوکھا پن ہے، جو سطح سے نیچے پہنچ کر حقیقت کے وہ روپ دیکھتا.
جو انسانی وجود پر براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں
ڈاکٹر محمد حسن عصری ادب دہلی۔

خود پہ احسان کے سِوا کیا ہے
چھوڑ دیں گے شراب کا کیا ہے

یا الٰہی ترے خزانے میں
کم نہیں ہے تو ماجرا کیا ہے

میں تو احساس بھی نہیں کرتا
پھر یہ دِل پر دباؤ سا کیا ہے

خط کی سرشاریاں ہی کافی ہیں
کون دیکھے لکھا ہوا کیا ہے

میں جو پڑھتا تو خط میں یہ پڑھتا
اِسکے اندر مِٹا ہوا کیا ہے

مختلف کے اشعار اگر انتخاب کرنے لگوں تو شاید ہی کوئی شعر چھوڑنے کے قابل ہو۔

سُبھاش گوڑ

واقعہ گھر تلاش کرتا ہوا
یہ بتا کتنے روز تک آیا

اِس طرح بے وطن نہیں ہوتے
ایک آنسو اگر ٹپک جاتا

پیڑ کے ساتھ کٹ گیا شاید
ایک جھونکا لہو لہو آیا

جھڑ گیا ہے جو اپنی قسمت سے
وہ ستارا بھی آپ جیسا تھا

صحن میں اپنے بال پھیلا کر
جیسے اِک اور دن نکل آیا



انہیں زمین کو آسمان کے تناظر میں دیکھنا بھی آتا ہے اور یہ اندھے مفاہیم کو فنی اظہار کی بینائی بھی عطا کرتے ہیں۔

عبد الاحد ساز بمبئی

کمزور سے امکاں میں اک اور بھی امکاں تھا
ہر شخص اکیلا تھا اور بے سروساماں تھا

سہمے ہوئے بیٹھے تھے سب اپنے اندھیرے میں
جاتے بھی کہاں بچ کے بستی میں چراغاں تھا

جو ٹوٹ کے بکھری تھی زنجیر تو میری تھی
لیکن ترا تہہ خانہ کیوں سر بہ گریباں تھا

کندھوں پہ جو رکھے تھے وہ بوجھ ہمارے تھے
جو چھوڑ کے آئے تھے وہ خانۂ یزداں تھا

چہرے کی لکیریں اب مفہوم سے خالی ہیں
تب برسرِ پیشانی اک حرف نمایاں تھا

احمد کمال پروازی کی شاعری کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ مواد کی تلاش میں تخیل کی حسین وادیوں میں سفر نہیں کرتے اور نہ ہی رومانیت کے دامن میں پناہ تلاش کرتے۔

پروفیسر عظیم الشان صدیقی دہلی،

بڑا ہو کہ اب آندھیاں کاٹتا ہے
یہ امکان کتنا ہرا ہو چکا ہے

میں چاروں طرف پھڑ پھڑانے لگا ہوں
یہ خنجر مجھے گدگدانے لگا ہے

تمنّا نہیں میٹھے پانی کی یارب
یہ صحرا مرا راستہ روکتا ہے

ہر طرف روشنی ہے مرے دل کے اندر
اکیلے میں کوئی یہاں جھولتا ہے

اُدھر کوئی چٹّان اونچی نہیں ہے
اِدھر آؤ سورج یہاں ڈوبتا ہے



غزل کی روایتی urbanity کو سامنے رکھ کر تو یہ بعُد ہمیں کئی ایسی حیرتوں سے دوچار کرے گا
جو قطعاً ہمارے لیئے ایک نئے تجربے کا حکم رکھتا ہے۔۔ پروفیسر عتیق اللہ۔ دہلی

کبھی کبھار کسی آنکھ سے ڈھلکتے ہیں
ہمارے اشک کبھی سر نہیں پٹکتے ہیں

سفر میں دشت تو سنجیدہ نام ہوتا ہے
وہ باغ ہوتے ہیں پتّے جہاں کھڑکتے ہیں

گلوں کا سارا دباؤ اسی زمین پہ ہے
یہیں پہ آن کے کانٹے بہت کھٹکتے ہیں

ہمارے بیچ کا جھگڑا اسی خیال پہ ہے
مرا یہ قول کہ آنسو یہیں چمکتے ہیں

یہ انتہا پہ پہنچنے کے بات ہے ورنہ
یہاں کے زخم ہی کیا لوگ بھی مہکتے ہیں

پروازی ان حقیقی فنکاروں میں سے ایک ہیں جنہوں نے آدابِ شاعری سے زیادہ آدابِ زندگی کو مطمحِ نظر بنایا ہے۔ مصور سبزواری ایوان اردو۔ دہلی

بہت مغرور حسرت ہے پرائے گھر نہیں جاتی
جلا کرتی ہے سینے میں کہیں باہر نہیں جاتی

ابھی بھی یہ روایت ہے ہمارے دل کی ویرانی
ہنسی بن کر نکلتی ہے برہنہ سر نہیں جاتی

اندھیرے میں بھی چہرے کا اندھیرا دیکھ لیتی ہے
کبھی یہ نیک سیرت شام خوش ہوکر نہیں جاتی

اب اکثر زندگی میں ایک ایسا موڑ آتا ہے
تیری چھوڑی ہوئی تنہائی بھی کہہ کر نہیں جاتی



انکے اشعار میں نئے استعارات، اصطلاحات تشبیہات اور علائم
اور پیکر غزل کو وسعت اور تازگی بخشتے ہیں۔

نوشاد احمد کریمی۔ بہار۔

کوئی تقریب ہونے والی ہے
شہر کی سیدھی آنکھ پھڑکی ہے

آدمی پھڑ پھڑا کے رہ جائے
کتنی گہری لکیر کھینچی ہے

ایک رتّی بھی کم نہیں لیتی
زندگی جب حساب کرتی ہے

اِک وسیلہ ہے نا امیدی بھی
اپنی تصدیق ہوتی رہتی ہے

گرد آلود معبدوں کی طرح
یہ گلی بھی بہت پرانی ہے

ڈھل چکی رات نوحہ خوانی کی
خامشی اعتراف کرتی ہے

زندگی لا تجھے ادا کر دیں
تو بھی اِک رسمِ نارسائی ہے

راست نہ سہی بلواسطہ ہی سہی مختلف کے دیدار تو ہوئے۔ ڈاکٹر یعقوب یاور

ابھی تو یہ کہ کوئی گھر بنا کے دیکھیں گے
پھر اس خیال کی مٹّی اُڑا کے دیکھیں گے

نہیں کہ یوں تو متانت یہ حرف آئے گا
ہم اپنا حال اکیلے میں جا کے دیکھیں گے

وہ جس کا حُسنِ تعلق پہ عکس پڑتا ہے
ہم اُس دیئے کی ذرا لو بڑھا کے دیکھیں گے

ہمارے پاس ازل سے سند جنوں کی ہے
تمہیں بغیر اجازت بھی آ کے دیکھیں گے

بس ایک پل میں دو عالم تلاش کر لینا
وہ ایک بار نگاہیں اُٹھا کے دیکھیں گے



ان کا تخلیقی عمل حالات کی جبریت کا خاموش منظرنامہ نہیں،
بلکہ یہ منافق سماج کے اجتماعی بھنور کا کراہتا ہوا ذہنی تشنج ہے،
مصوّر سبزواری ایوان اردو، دہلی

یہاں معمول سے بازار کیسے کٹنے لگتے ہیں
دُکانیں اُوب جاتی ہیں اُجالے کٹنے لگتے ہیں

تمہیں معلوم کیا نقصان ہیں ہیرا تراشی میں
ذرا سا چوک جاؤ تو نگینے کٹنے لگتے ہیں

وہ خود مختار ہو کے جب مرے دفتر میں آتا ہے
تخاطب ڈگمگاتا ہے اِرادے کٹنے لگتے ہیں

پھر اُن کا رنگِ پیراہن اُفق پر پھیل جاتا ہے
یہ صورتحال وہ ہے جب اندھیرے کٹنے لگتے ہیں

جوانی اور بوڑھے پن میں بے شک فرق ہوتا ہے
مگر یہ فرق آتا ہے تو بچّے کٹنے لگتے ہیں



احمد کمال پروازی کے یہاں وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو ایک روایت سے باخبر نئے شاعر کے یہاں ہونا چاہئے۔ انکی شاعری انکے بیش تر ہم عصروں سے بالکل مختلف ہے۔

نوشاد احمد کریمی۔ بہار

شور کرتا ہوا طیّارہ نکل جاتا ہے
اتنی ٹوٹی ہوئی آواز پہ کون آتا ہے

میرے ہاتھوں سے مجھے قتل کرانے کے لئے
اک شجر روز مرے ہاتھ سے کٹواتا ہے

پٹّیاں آنکھ پہ نبدھوا کے بلاتا ہے ہمیں
کس کو معلوم کہاں راستہ بل کھاتا ہے

اپنے ہاتھوں سے مری خاک اُڑادی پھر بھی
وہ مرے سامنے آتا ہے تو گھبراتا ہے

میں تری راہ کا اِک ایسا مسافر ہوں کہ جو
اپنے بکھرے ہوئے سامان پہ سو جاتا ہے



غزلیں زندگی میں شرکت، تجربے و مشاہدات کی صداقت، اظہارِ بیان میں خلوص و دردمندی کا ثبوت فراہم کرتی ہیں انکی شاعری کا منظرنامہ محض ذات تک محدود نہیں ہے۔
پروفیسر عظیم الشان صدیقی دہلی،

اِس شہرِ نامراد کی عزّت کرے گا کون
ہم بھی چلے گئے تو محبت کرے گا کون

اِس گھر کی دیکھ ریکھ کو ویرانیاں تو ہوں
جالے ہٹا دیئے تو حفاظت کرے گا کون

صدمے سے ٹوٹنے کے لئے کچھ تو چاہیئے
کچھ بھی نہیں تو اس کی شکایت کرے گا کون

ہم جیسے خاکسارِ وطن کے سوال پر
یہ سر بھی جھک گیا تو وضاحت کرے گا کون

مجھ کو خبر تو ہے کہ تو کمزور ہے مگر
میں یہ بھی جانتا ہوں حمایت کرے گا کون

اِنکی شاعری اپنی پیشِ رونسل کی کورانہ تقلید کے بجائے زمین اور زندگی کے کھرے تجربات عبارت ہے۔ڈاکٹر صادق۔دلّی یونیورسٹی۔

دلّی دربار بکھرنے کے لئے ہوتا ہے
شاہ مسند سے اُترنے کے لئے ہوتا ہے

ٹھوکریں کھا کے تڑپتے تو بہت ہیں لیکن
غصّہ بچّوں پہ اُترنے کے لئے ہوتا ہے

فن کسی شخص کو چھوٹا نہیں رہنے دیتا
رقص بھی حد سے گزرنے کے لئے ہوتا ہے

سورما ہو تو مقابل سے جھجکنا کیسا
آئینہ سامنا کرنے کے لئے ہوتا ہے

اس میں جینے کی تمنّا ہی عجب لگتی ہے
پیار تو ڈوب کے مرنے کے لئے ہوتا ہے

احمد کمالؔ پروازی کی عصری حسیت اور شعور بھی خود کو زمانے کے تقاضوں سے محروم نہیں رکھتا،
انکے یہاں بھی کہیں کہیں حسین چہرے ابھر کر زندگی کا ثبوت فراہم کرتے رہتے ہیں
یادوں کی چاندنی زندگی کے زخموں کے لئے مرہم بن جاتی ہے۔ پروفیسر عظیم الشان صدیقی دہلی

زباں رسید سی چہرہ لگان جیسا ہے
وہ سر سے پانو تک ہندوستان جیسا ہے

خدا کے فضل سے سونا اُگل رہی ہے زمیں
مگر کسان تو اب بھی کسان جیسا ہے

کوئی جلائے تو ایک پل میں خاک ہو جائے
ترا مکان بھی میرے مکان جیسا ہے

جو امتحان بھی باضابطہ نہیں دیتا
یہ ذہن آج بھی اُس نوجوان جیسا ہے

جو مجھکو یاد ہو وہ ایک بھی سوال نہیں
یہ وقت تجھ پہ کسی امتحان جیسا ہے

غزلیں اپنے فطری پن، بے ساختگی، آمد و روانی اور جزبہ و خیال کی شدت کا احساس دلاتی ہیں۔
پروفیسر عظیم الشان صدیقی دہلی،

محبتوں کے لئے دوڑنا تو پڑتا ہے
نئے سرے سے سرا جوڑنا تو پڑتا ہے

حضور آپ تو شطرنج کھیلتے ہیں مگر
ہمیں اِدھر سے اُدھر دوڑنا تو پڑتا ہے

وہ کھیل جس کو عداوت کا کھیل کہتے ہیں
اُسے کبھی نہ کبھی چھوڑنا تو پڑتا ہے

تو بے قصور ہے اے زندگی ہمیں پھر بھی
ترے خلاف قلم توڑنا تو پڑتا ہے

خود اپنے ضبط کی گہرائی ناپنے کے لئے
دوا بھی ہو تو اُسے چھوڑنا تو پڑتا ہے



انکی غزلوں میں کسان کا درد ہے پُلوں کے نیچے زندگی جینے والوں کی داستان بھی ہے۔
چاند اور سمندر کے رشتے، تو مکّار ہوتی جا رہی راج نیتی کی فطرت بھی ہے۔
''شری رام دوے'' پتر کار، وساہتہ کار۔

شدید چوٹ پہ جب ضبط کرنا پڑتا ہے
فرشتہ ہو تو اُسے بھی بکھرنا پڑتا ہے

خبر یہ آئے کہ کل بھی سحر نہیں ہوگی
تو اُنکی بات کو تسلیم کرنا پڑتا ہے

فساد شہر میں بے ضابطہ نہیں ہوتے
یہ اِک لگان ہے ہر سال بھرنا پڑتا ہے

مُنافقین محبّت کو کیا سمجھتے ہو
گزرتی ''ریل'' سے نیچے اُترنا پڑتا ہے

ہم اپنی جامہ پزیری بحال کیسے کریں
ہمیں تو شہر سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے

سب کچھ ملا کر مختلف کی غزلیں دیکھنا اپنے آپ سے روبرو ہونے کا ایک خوشگوار تجربہ ہے

سُبھاش گوڑ

مرا تو سر تھا مگر اُس پہ بوجھ کتنا تھا
سپاہ اُسکی تھی دربار بھی اُسی کا تھا

وہ اِس پہ خوش تھے کہ صورت نہیں نکلنے کی
میں مطمئن تھا کہ اقبالِ جُرم کرنا تھا

جو سید ھا ابنِ ستم گر کے حق میں جاتا ہے
وہی بیان مجھے یاد کر کے دینا تھا

سبھی کو جان بچانے میں لُطف آجاتا
اِس آدمی کو صفِ دشمنان میں ہونا تھا

ہم ایسے لوگ تواریخ میں نہیں رہتے
یہ مشورہ تو کسی بادشہ کو دینا تھا



ایک مدت بعد اچھے اشعار نظر سے گزرے، آپ کے لہجے کی کاٹ نے متاثر کیا،
آپ کے اشعار میں وہ پہلو ملے جنہیں تلاش کرتا ہوں، پسند کرتا ہوں ۔ڈاکٹر اختر نظمی۔

مرے دن رات پر یہ بھی کرم ہوتا تو سب ہوتا
اکیلے میں کوئی اچھا سا غم ہوتا تو سب ہوتا

سبھی کچھ کھو دیا ہے اس طرح محتاط رہ رہ کر
قیامت ٹوٹتی کھل کر ستم ہوتا تو سب ہوتا

مجھے کچھ اور رہنا تھا اسی غفلت کے عالم میں
بھرم کے ٹوٹنے پر بھی بھرم ہوتا تو سب ہوتا

بہت خوش حال رکھا ہے اے رسمِ زندگی تو نے
بھروسہ تجھ پہ لیکن کم سے کم ہوتا تو سب ہوتا

مسلسل سوچنا ہے اس لئے کچھ ہو نہیں سکتا
اگر یہ فاصلہ اک دو قدم ہوتا تو سب ہوتا

آپ غزل کے رمز سے واقف ہیں یہ بڑی بات ہے
ورنہ آجکل غزل کے نام پر جو کچھ لکھا جا رہا ہے، غزل نہیں ہے۔

مظہر امام۔ دہلی

چُپ چاپ اُجڑ جاتے ہیں شورش نہیں ہوتی
گاؤں میں تباہی کی نُمائش نہیں ہوتی

ہم لوگ کبھی پانی پہ جھگڑا نہیں کرتے
یہ شہر الگ ہے یہاں بارش نہیں ہوتی

کیا ٹھیک کسی جشنِ مبارک ہی میں گُھل جائے
اب خون کے دوران پہ بندش نہیں ہوتی

کس درجہ طبیعت میں اُلٹ پھیر ہوا ہے
اِس پار سے اُس پار کی خواہش نہیں ہوتی

کیا شہر بھی باطن میں خُدا ڈھونڈ رہا ہے
کیا بات ہے اب کوئی نمائش نہیں ہوتی

سماج کی اصلیت کا بیان ہے تو شاعر کا اپنا سوابھیمان بھی ہے، گویا جس منظر پر بھی انکی قلم چلی ہے اسے اتنا پختہ اور کمال کا بنادیا ہے کہ تنقید کرنے والوں کو اس میں نقص نکالنے میں کٹھنائی آتی ہے، ''شری رام دوے'' پتر کار، وساہتہ کار۔

اے اربابِ وطن قائم مرا معیار کر دینا
میں پیاسا آؤں گا تم کربلا تیّار کر دینا

مری مجبوری یہ ہے کہ مجھے شاداب ہونا ہے
تجھے یہ حق پہنچتا ہے تو صحرا زار کر دینا

اگر میں آگ ہونے کے لیئے بے تاب ہو جاؤں
تو پردہ کھینچ دینا کھینچ کر دیوار کر دینا

یہ ایسی دھار ہے جو سیدھی آئندہ پہ پڑتی ہے
اگر یہ پار کر جائے تو خود مختار کر دینا

ہمیں سر پیش کرنے کا ہُنر پہلے سے آتا ہے
مگر وہ بے خبر ہوگا اُسے ہُشیار کر دینا

وسط ہند کے نوجوان شاعروں میں احمد کمال پروازی مجھے زیادہ عزیز ہے۔ اسلئے نہیں کے وہ میرا اہم مکتب اور دوست ہے۔ بلکہ اِس لئے بھی کہ وہ ایک منفرد غزل گو ہے۔ ڈاکٹر صادق۔ دلّی یونیورسٹی۔

محبّت کرنے والوں سے محبّت تم کو کرنا ہے
تمہارا مسئلہ ہے یہ حکومت تم کو کرنا ہے

تمہارے فیصلوں پر فیصلے سب چھوڑ رکھے ہیں
اگر نفرت بھی کرنا ہے تو نفرت تم کو کرنا ہے

فقیروں سے خوشامد کی کوئی اُمّید مت رکھنا
امیرِ شہر تو تم ہو یہ زحمت تم کو کرنا ہے

ہم اپنے گوشۂ تخلیق میں مصروف ہیں جاناں
یہاں تک چل کے آنے کی مشقّت تم کو کرنا ہے

ہم اپنا کام کرتے ہی چلے جائیں گے محفل سے
پھر اسکے بعد اُردو کی حفاظت تم کو کرنا ہے

احمد کمال پروازی کا کوئی شعر ان معنوں میں بھی اکہرا نہیں ہوتا کہ اس نیں صرف شعری اظہار ہو، یا صرف وژن اور فلسفہ انہوں نے غزل کے جس لہجے کو متعارف کیا ہے وہ اس صنف کی زندگی دراز کرنے کی ضمانت دیتا ہے۔ پروفیسر علیم اللہ حالی، توازن مالیگاؤں،

اب دلوں کو بھی مزاجاً دِلّی ہونا چاہیئے
اپنی بستی کو دھویں کا عادی ہونا چاہیئے

پیٹھ میں خنجر ہو لیکن میزبانی میں رہیں
بھول جانے کی ریاضت اتنی ہونا چاہیئے

باوفا ہونا پسندیدہ رویہ ہے مگر
اِس روایت کا کوئی منکر بھی ہونا چاہیئے

اِک ذراسی بات پر مجذوب ثابت کردیا
مشورہ یہ تھا کے فریادی بھی ہونا چاہیئے

بُردباری یہ ہوئی کہ بے وجہ مت بولیئے
ہاں مگر سنجیدگی بھی سچّی ہونا چاہیئے

احمد کمال پروازی نے اپنے اشعار میں، بیشتر تشبیہات استعارے، تمثیل، پیکر اور علامات فطرت سے اخذ کیئے ہیں۔ اور انہیں سے انکی امیجری تعمیر ہوئی ہے۔

نوشاد احمد کریمی۔ بہار۔

یہ بزمِ شعر ہے لہجہ شمار ہوتا ہے
یہاں حساب نہیں اعتبار ہوتا ہے

اُبھر کے آتے ہیں یارانِ گمشُدہ پہلے
پھر اُسکے بعد وطن آشکار ہوتا ہے

کچھ اِس لئے بھی ستمگر ستم نہیں کرتا
ہمارا ردِّ عمل شاندار ہوتا ہے

یہ انتظار کوئی واقعہ نہ بن جائے
اکیلے پن میں بڑا اختیار ہوتا ہے

بس اک بیان سے فردوس تک اُتر آئے
پر اس قدم سے کفن داغ دار ہوتا ہے



اب آپ مختلف سے بہت آگے نکل چکے ہیں۔ آپکی تازہ غزلیں
اور مختلف کے درمیان ایک خلاء سا محسوس ہوتا ہے۔
سہیل اختر بھونیشور۔

غریب شہر کا سر ہے کہ شہر یار کا ہے
یہ ہم سے پوچھ کہ غم کون سی قطار کا ہے

کسی کی جان کا نے مسئلہ شکار کا ہے
یہاں مقابلہ پیدل سے شہسوار کا ہے

اے آب و تابِ ستم مشق کیوں نہیں کرتا
ہمیں تو شوق بھی صحرائے بے حصار کا ہے

یہاں کا مسئلہ مٹّی کی آبرو کا نہیں
یہاں سوال زمینوں پہ اختیار کا ہے

وہ جس کے ڈر سے کبھی زندگی نہیں دیکھی
یہ آدھا چاند اُسی شہرِ یادگار کا ہے

یہ ایسا ہے تاج ہے جو سر پہ خود پہنچتا ہے
اِسے زمین پہ رکھ دو یہ خاکسار کا ہے

یہ اُسکے بعد ہے تحریر کیا نکلتی ہے
ابھی سوال تو اپنے پہ اختیار کا ہے

راست نہ سہی بلواسطہ ہی سہی مختلف کے دیدار تو ہوئے۔ ڈاکٹر یعقوب یاور

کچھ ایسی بات تھی کہ سنبھلنے سے رہ گیا
میں بد مزاج گود میں پلنے سے رہ گیا

اِک بزم اپنے آپ سے محروم ہو گئی
اِک برف کا پہاڑ پگھلنے سے رہ گیا

غم کے بغیر جشن مکمّل نہ ہو سکا
ایسا لگا کہ کوئی مچلنے سے رہ گیا

چھوٹی سی ایک نوکری زنجیر بن گئی
مسجد میں اِک چراغ تھا جلنے سے رہ گیا

مقتول اپنی موت کا خود ذمّے دار ہے
پوچھا تو اپنا نام بدلنے سے رہ گیا

اِک دن بھی بے وفائی کی لذّت نہیں ملی
آنکھوں میں اشک بھر کے نکلنے سے رہ گیا



احمد کمال پروازی شعر گوئی کی باریکی سے واقف ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ دو مصرعوں کا ربط کتنی نزاکت اور باریکی کا کام ہے شاعر نے متعدد اشعار کے ذریعے اردو غزل گوئی میں ایک نئے لہجے کا اضافہ کیا ہے۔،

پروفیسر علیم اللہ حاؔلی، توازن مالیگاؤں۔

کنوارے آنسوؤں سے رات گھائل ہوتی رہتی ہے
ستارے جھڑتے رہتے ہیں ''ریہرسل'' ہوتی رہتی ہے

سیاسی مشق کر کے تم تو دِلّی لوٹ جاتے ہو
یہاں سہمے ہوئے لوگوں میں ہلچل ہوتی رہتی ہے

وہاں رکھے ہوئے مُہرے برابر مرتے رہتے ہیں
ادھر کھیلی ہوئی بازی مکمّل ہوتی رہتی ہے

میں سب کچھ بھول کے جینے کی کوشش کرتا رہتا ہوں
مگر گزری ہوئی وہ رات پاگل ہوتی رہتی ہے

نجانے کیا خرابی آگئی ہے میرے لہجے میں
نجانے کیوں مری آواز بوجھل ہوتی رہتی ہے

مجھے کہنے دیجئے کہ یہ اختلاف کہیں ٹیڑھ سے جاملتا ہے، تو کہیں گھاؤ سے یا یہ کہیئے کہ اپنی بات کو چیزِ دیگر بنا کر پیش کرنے کا اِسے ایک ہنر ہاتھ لگ گیا ہے۔

پروفیسر عتیق اللہ۔ دہلی،

اِس اندھے قید خانے میں کہیں روزن نہیں ہوتا
بکھر جاتے طبیعت میں اگر بچپن نہیں ہوتا

تجھے کیا علم کہ ہر چوٹ پہ تارے نکلتے ہیں
وہ آدم ہی نہیں جسکا کوئی دشمن نہیں ہوتا

اُنہیں بھی ہم نے سیّاروں سے واپس آتے دیکھا ہے
جہاں بس عشق ہوتا ہے کوئی ایندھن نہیں ہوتا

ہماری نامُرادی میں وفاداری بھی شامل ہے
اگر کچھ اور ہوتے تو یہ پیراہن نہیں ہوتا

بہت ممنون ہوں پھر بھی اندھیرے کم نہیں ہوتے
اگر تم میرے گھر ہوتے تو وہ روشن نہیں ہوتا



''مختلف'' نئی اردو غزل کے لئے معیار ساز مجموعہ ہے،۔

پروفیسر علیم اللہ حالی، تو ازن مالیگاؤں،۔

آخری معرکہ اب شہرِ دھواں دھار میں ہے
میرے سرہانے کا پتھر اِسی دیوار میں ہے

اب ہمیں پچھلے حوالے نہیں دینا پڑتے
اِک یہی فائدہ بگڑے ہوئے کردار میں ہے

بیش تر لوگ جسے عمرِ رواں کہتے ہیں
وہ تو اِک شام ہے اور کوچۂ دلدار میں ہے

یہ بھی ممکن ہے کہ لہجہ ہی سلامت نہ رہے
مجلسِ شہر بھی اب شہر کے بازار میں ہے

دل کہاں اپنی ریاست سے الگ جاتا ہے
وہ تو اب بھی اِسی اُجڑے ہوئے دربار میں ہے



کمال ہمارے ان محدود ترین شعراء میں سے ایک ہیں جنھوں نے فطرت کے تلازمات اور متعلقات کو رسمی طور پر اخذ نہیں کیا بلکہ دیہات ان کا ذاتی تجربہ ہے۔

پروفیسر عتیق اللہ۔ دہلی

تنہائی اسی موڑ پہ چکرا کے گری ہے
رک جاؤ کہ پہلے بھی یہیں شام ہوئی ہے

خیموں سے پرندوں کی طرح آگ اُڑی ہے
دریا سے جو نکلی ہے وہ نیزے کی اَنی ہے

اِک اور قیامت سے اُلجھنے کی تمنّا
ہم خانہ بدوشوں کے یہاں جھول رہی ہے

موجوں سے تڑپتے ہوئے دریا کے کنارے
اکثر مرے کانوں نے تری پیاس سُنی ہے

شہروں کا بھٹکنا مری عادت کا کرم تھا
جنگل کی شروعات تری یاد نے کی ہے

افسوس تو یہ ہے کہ مرے مدّ مقابل
قاتل ہیں مگر وار میں کاجل کی کمی ہے

غزل میں مختلف ہونا بڑے دل گردے کا کام ہے لہجہ ذرا اونچا ہوا تو آواز پھٹ جاتی ہے اور دھیما ہوا تو دوسری آوازوں میں گم ہو جاتا ہے لیکن خوشی کا مقام ہے کہ احمد کمال پروازی نے نہ تو اپنے لہجے کو پھٹنے دیا ہے اور نہ ہی انکی آواز دوسری آوازوں میں گم ہوئی ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن عصری ادب دہلی۔

تمہاری واپسی ہونے کا اندازہ نہ ہو جائے
کہیں بکھری ہوئی مٹی تر و تازہ نہ ہو جائے

فرشتو تم نے بے آواز اندیشے نہیں دیکھے
یہی دیوار آگے بڑھ کے دروازہ نہ ہو جائے

بڑی خواہش ہے پھر سے زندگی ہموار کرنے کی
مگر اِس سے کہیں مسمار شیرازہ نہ ہو جائے

ابھی تک تو نتیجہ بھی پسِ دیوار ہے جاناں
تیری اِس محویت سے کل کا اندازہ نہ ہو جائے

شباہت پہ اداکاری اثر انداز ہوتی ہے
ابھی تک تو یہ چہرہ ہے کہیں غازہ نہ ہو جائے

غزل کی بساط میں گاؤں اور اس کی زندگی کو پورے شاعرانہ رکھ رکھاؤ کے ساتھ
ادا کرنے کی کوشش بڑے حوصلے کی بات ہے۔

پروفیسر عتیق اللہ۔ دہلی

جنوں میں آ کے چیخو مت صدا آگے نہیں جاتی
یہاں کے بالا خانوں سے ہوا آگے نہیں جاتی

تعلق کے اسی درجے پہ تارا ٹوٹ جاتا ہے
یہاں کچھ بات ایسی ہے اَنا آگے نہیں جاتی

ابھی بھی موم بتّی لے کے اپنے گھر میں آتا ہوں
ابھی بھی روزمرّہ سے رِدا آگے نہیں جاتی

محبت نے کئی اُڑتے ہوئے پیکر دکھائے ہیں
مگر اُس قامت و قد سے گھٹا آگے نہیں جاتی

مجھے معلوم ہے یہ دنیا کتنا چھوٹا خنجر ہے
کبھی بھی اپنی گردن سے فضا آگے نہیں جاتی

انکی شاعری بے جا تصنع و تکلف سے اور مبالغہ آرائی سے محفوظ رکھتی ہے۔
جسکی وجہ سے اِسکی سادگی اور لطافت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔
پروفیسر عظیم الشان صدیقی دہلی،

چلے گئے جنہیں خانہ خراب کرنا تھا
میں رُک گیا ہوں کہ مجھکو حساب کرنا تھا



طوافِ کوچۂ جاناں تو اِک نمائش تھی
خود اپنے آپ کو عزّت مآب کرنا تھا



سخن وری کے علاوہ بھی عُمر کٹ جاتی
مگر مجھے تو تمہیں بے نقاب کرنا تھا

•

وہ زندگی تھی جسے نامُراد رکھنا تھا
یہ تجربہ تھا جسے کامیاب کرنا تھا



تو زندگی کا مسافر تھا کیسے لوٹ آیا
تجھے تو دھوپ میں چہرہ خراب کرنا تھا

بھارتیہ غزل کے بدلتے مزاج کا ایک ' سشکت ہستاکشر' ہے کمال پروازی۔

ایڈوکیٹ سُبھاش گوڑ۔ ساہتیہ کار

زندگی تو ہمیں ہشیار نہ ہونے دینا
اپنے حصّے کا بھی حقدار نہ ہونے دینا

اے مُحافظ مرا انجام سلامت رکھنا
مُجھ کو اِس شہر سے بے زار نہ ہونے دینا

عُمر بھر آدمی ہونے کی ضمانت نہ ملے
کوئی بستی کہیں گھر بار نہ ہونے دینا

میں نے تنہائی کو معیار بنا رکھا ہے
اِس سے بہتر مرا معیار نہ ہونے دینا

بعد میں تھام بھی لیتا ہے رفیقوں کی طرح
اِسکو کہتے ہیں کسی پار نہ ہونے دینا

سچ کا اپنا ایک انوکھا پن ہوتا ہے، جو کبھی کبھی جھوٹ سے زیادہ حیران کن اور جھوٹ سے زیادہ جھوٹ کا تاثر فراہم کرتا ہے۔

پروفیسر عتیق اللہ۔ دہلی

اکیلا حق ادا کرنے کی استعداد رکھتا ہوں
وطن کی آبرو کیسے بچانا یاد رکھتا ہوں

میں طالب علم چورا ہے پہ ہندوستان کی خبریں
اب اِن سوکھے ہوئے چہروں کو پڑھ کر یاد رکھتا ہوں

مقدمہ ساز کو یہ غم بہت بیچین رکھتا ہے
کہ میں بدحال ہوں پر سیرتِ اجداد رکھتا ہوں

خدا کا شکر کہ مجھکو اذیّت راس آتی ہے
جہاں ایڑی رگڑتا ہوں وہیں بنیاد رکھتا ہوں

تمہیں کتنا لہو اور چاہیئے سیراب ہونے میں
کہ میں برباد ہوں لیکن تمہیں آباد رکھتا ہوں

احتجاج اگر چہ مثبت اقدار کی طرف سفر کی پہلی منزل ہے لیکن ہر سفر اپنی سمت و رفتار کا بھی مطالبہ کرتا ہے۔ کبھی کبھی خوف و دہشت کی شدید فضا کی وجہ سے خود کو ابہام کے قالب میں ڈھال لیتا ہے۔ حرّیت پسندی کبھی مجروح نہیں ہوتی احمد کمال کے احتجاجی لب ولہجہ میں یہ روح کارفرما ہے۔

پروفیسر عظیم الشان صدیقی دہلی

ڈکھوں میں آبروئے قدّ وقامت بھول جاتے ہیں
پریشاں لوگ لہجے کی نفاست بھول جاتے ہیں

تعاقب چھوڑ دے اے زندگی کچھ یاد کرنے دے
تری عُجلت میں ہم اپنی ضرورت بھول جاتے ہیں

ہم اپنے شہر کی منڈی کے وہ ناکام تاجر ہیں
کہ جب ''گُر'' یاد رکھتے ہیں تو قیمت بھول جاتے ہیں

ستم تو ٹھیک ہے لیکن تم اپنے آپ سے بچنا
ہم آنسو پوچھ لیتے ہیں اذیت بھول جاتے ہیں

ہمارے عصر کے رشتوں کی کیا تعبیر نکلی ہے
ذرا سی دیر ہو جائے تو صورت بھول جاتے ہیں

اسکی شاعری میں آنے والی نسل کے مستقبل کی تعمیر کے حسین خواب پوشیدہ ہیں۔

ڈاکٹر صادق۔ دلّی یونیورسٹی۔

سر بہ زانو کوئی فنکار الگ بیٹھا ہے
میں یہاں ہوں میرا کردار الگ بیٹھا ہے

شہر میں نامۂ تصدیق لکھا جائے گا
مطمئن ہوں مرا انکار الگ بیٹھا ہے

تیری تعریف میں سب بول رہے ہیں لیکن
اس پہ حیرت ہے کہ معیار الگ بیٹھا ہے

غیر محفوظ ہیں دیوار بنانے والے
اور شہنشہ سرِ مینار الگ بیٹھا ہے

اب دباؤ گے تو پتھر سے نکل آئے گی
ایک آواز کہ حق دار الگ بیٹھا ہے

غزلیں اپنے فطری پن، بے ساختگی، آمد و روانی اور جذبہ و خیال کی شدت کا احساس دلاتی ہیں۔
پروفیسر عظیم الشان صدیقی دہلی،

زندگی کے خول کو اِک کشتِ سبزہ دار دے
حاشیہ درکار ہے اِس پار یا اُس پار دے

اب کہاں تقسیم کو بے ضابطہ ہونے کا ڈر
بیٹھ جائیں گے وہیں پر تو جہاں دیوار دے

ٹھوکروں نے جرم کا اقرار تو کروالیا
دیکھنا ہے شام کس کے ہاتھ میں تلوار دے

آنے والی نسل کو بے خوف ہونا چاہیے
عہد سے انکار کر یا نامۂ اقرار دے

سر بہ زانو صحن بھی شاداب ہونا چاہیے
ایک ایسا پیڑ جو ہر پھول موسم وار دے

کمال کی شاعری اپنی ترکیب میں مختلف پن کا شدید احساس دلاتی ہے۔
پروفیسر عتیق اللہ۔ دہلی،

شعورِ حرفِ وفا کا امین کردیں گے
ہم اپنے بعد تمہیں جانشین کردیں گے

اِن آنسوؤں میں گھنے بادلوں کے تیور ہیں
برس گئے تو زمیں ''ریشمین'' کردیں گے

فقیرِ شعر و ادب ہیں پہ دستکار بھی ہیں
تراش کر تیرا لہجہ حسین کر دیں گے

کسی نے ہم سے قیادت کا حال پوچھا تو
ہم اسکے آگے پھٹی آستین کر دیں گے

بس ایک نعرہ ہمارے خلاف لکھ دیجے
یہ لوگ آپ کو مسند نشین کر دیں گے

یہ لوگ یونہی چکرورتی بیاج لیتے رہے
تو ایک روز ہمیں بھی ذہین کر دیں گے

سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی نے بہت کچھ دینے کے باوجود ذہنی، فکری، روحانی، سکون، واطمینانی کو غارت کردیا ہے اور یہ ایک ایسا المیہ ہے جسکو تقریباً ہر نئے شاعر نے اپنے طور پر برتا ہے۔ ''مختلف'' میں بھی اسکی جا بجا جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔

نوشاد احمد کریمی۔ بہار۔

اپنے ماں باپ کے کندھوں سے اترنا سیکھو
دوسرے دور کی تیاریاں کرنا سیکھو

ہونہارو یہ تقاضہ ہے کہ تعلیم کے بعد
وقت کے ساتھ رہو جیب کترنا سیکھو

یہ تو اچھا ہے کہ حق مار رہے ہو لیکن
اس سے کیا ہوگا ابھی اور نکھرنا سیکھو

قتل ہونے کی صفت بعد کے اسباق میں ہے
پہلے خنجر کی کسوٹی پہ اترنا سیکھو

ہم تو ہر وقت محاذوں پہ رہا کرتے ہیں
تم بھلے لوگ ہو باقاعدہ مرنا سیکھو

احمد کمال پروازی کے یہاں نئی حسیت کے ساتھ روایت کا قابل قدر لحاظ بھی ہے نتیجتاً انکے اشعار انفرادی فکر وشعور کے ترجمان نظر آتے ہیں۔ نوشاد احمد کریمی۔ بہار۔

اس قدر سر جھکا جھکا دوں گا
تجھ کو ہندوستاں بنا دوں گا

تو مرے فن کی زد پہ مت آنا
ہر ستم عالمی بنادوں گا

شرط رکھنے کی بات مت کرنا
اپنی تصویر تک ہٹا دوں گا

آزمانے کا حوصلہ کرلو
سر اٹھانا تو میں سکھا دوں گا

اے خدا تو نظر نہ آلیکن
میں تری حاضری لگا دوں گا

احمد کمال پروازی کے اشعار کا تجزیہ کیا جائے تو، اقدار کی شکستگی کا المیہ نئی سج دھج کے ساتھ نظر آئے گا۔
نوشاد احمد کریمی۔ بہار۔

جب گھر طلب کیا تو گزارے سے کٹ گیا
میرا جہاز دونوں کنارے سے کٹ گیا

پہلے تو گھر میں رہنے کی عادت سی ڈال دی
اب کہہ رہے ہیں قوم کے دھارے سے کٹ گیا

وہ اپنی قوم کے اوتار بن گئے
ہندوستان جن کے اشارے سے کٹ گیا

جتنے بھی لوگ تھے وہ تشدّد پسند تھے
یہ بھی جواز تھا جو ادارے سے کٹ گیا

یہ کیا خبر تھی اُن کا اُفق پہرے دار ہے
چھونے گیا تو ہاتھ ستارے سے کٹ گیا

احمد کمال پروازی، روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے تمام واقعات ورجحانات کوفن کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔اورانہیں کھوٹے کھرے کی کسوٹی پر، پرکھ کرشعر کی شکل میں پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔
نوشاداحمد کریمی۔بہار۔

پانو الجھ رہے ہیں زمینیں کدھر گئیں
بازار کھل گیا میری جیبیں کدھر گئیں

ان کا حساب یہ کہ زرِ اصل رہ گیا
یہ مسئلہ نہیں ہے کہ قسطیں کدھر گئیں

بارش پرست لوگ ادھر ہیں اُدھر بھی ہیں
اب دیکھنا ہے کالی گھٹائیں کدھر گئیں

یہ دل تو آزمایا ہوا سر فروش ہے
جو آزما رہیں تھیں وہ چیزیں کدھر گئیں

جس کو بُلا رہے ہو وہ محشر پسند ہے
پھر بعد میں نہ کہنا قناتیں کدھر گئیں

احمد کمال پروازی کا لہجہ نئی شاعری کی اس بھیڑ میں بھی آسانی سے پہچانا جانے والا نہایت ہی منفرد اور معتبر لہجہ ہے۔نوشاد احمد کریمی ۔ بہار۔

کس کے گھر جاؤں یہاں سب نے مشینیں کرلیں
توڑ کر اپنے مکانوں کو دکانیں کر لیں

میں نے کردار سے گرتے ہوئے لوگوں کی طرف
اتنا دیکھا ہے کہ کمزور نگاہیں کر لیں

میں بھی زندہ ہوں یہ تصدیق کرانے کے لیئے
در بہ در بھٹکا زمانے کی دوائیں کر لیں

وہ تو اب چاند ستاروں کو اماں دیتا ہے
تم نے جس شخص کی تقسیم زمینیں کرلیں

زندگی سے ابھی نمٹا بھی نہیں تھا کہ کمال
بھائی لوگوں نے مری ''شوک سبھائیں'' کرلیں

''مختلف'' کا شاعری کئی معنوں میں دوسروں سے مختلف ہے۔ اسکی غزلوں میں فنّی کرتب ہیں نہ ردیف کی بوالعجبی نہ قافیے کے ذریعہ قادرالکلامی کا مظاہرہ، مانگے کی قنوطیت اور دلگرفتگی جو حال میں ہماری شاعری کی کیفیاتی پہچان بن گئی ہے ''۔ ڈاکٹر محمد حسن عصری ادب دہلی۔

اُردو لہجے نے شرر خیز بھی ہونے نہ دیا
شاعری نے ہمیں چنگیز بھی ہونے نہ دیا

ہم نے تعمیر کو طوفان کی زد پر رکھا
اور طوفان بہت تیز بھی ہونے نہ دیا

طیش میں آئے مگر فن کو بچائے رکھا
ہوش نے معرکہ خوں ریز بھی ہونے نہ دیا

دشمنی تو نے زمیں بانجھ بنا کر رکھ دی
سرحدو تم نے تو زرخیز بھی ہونے نہ دیا

ہم نے رشتے بڑے زرخیز بنائے لیکن
شعر ابہام سے لبریز بھی ہونے نہ دیا



''مختلف'' میں ایسی شاعری کا رنگ و آہنگ غالب ہے جو محض نشاط و کرب یا قنوطیت یا رجائیت سے اپنی پہچان نہیں چاہتی بلکہ زندگی کی کیفیات کو کھلے دل اور کشادہ جبینی سے قبول کرتی ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن عصری ادب دہلی۔

آخری فرض بچا ہے اسے پورا کر دوں
کوئی مل جائے تو اس شہر کا سودا کر دوں

کون رکھے گا خبر بعد میں اس رشتے کی
لاؤ ماں باپ کی تصویر کو اُلٹا کر دوں

بعد میں اور بھی اک لمبا سفر کرنا ہے
دیر ہو جائے گی بارات روانا کر دوں

آبلہ ہاتھ کا دیکھا بھی نہیں تھا میں نے
اب وہ کہتا ہے اسے توڑ کے تارا کر دوں

وہ بلندی سے بلندی کی طرف جاتا ہے
کیسے دیکھے گا مگر ہاتھ تو اونچا کر دوں

کمال پروازی بھی اسی دور کا شاعر ہے لیکن اپنی باخبری کی وجہ سے بڑی حد تک دوسروں سے مختلف بھی ہے پروفیسر عتیق اللہ۔ دہلی

سفر خلافِ سفر ہو گیا تو کیا ہوگا
یہ بادبان بھنور ہوگیا تو کیا ہوگا

ابھی تو شک ہے غلط رہ نمائی کرنے کا
ہمیں یقین اگر ہوگیا تو کیا ہوگا

فقیر ہونے کے اسباب پوچھنے والا
اگر جواب کے سر ہو گیا تو کیا ہوگا

ذرا سی دھوپ سرکنے سے دل دھڑکتا ہے
یہ دن غروب اگر ہو گیا تو کیا ہو گا

مجھے تو صرف محبت ہی پڑھنا آتا ہے
یہ لفظ شہر بدر ہو گیا تو کیا ہو گا

اپنے حسی وفکری تجربوں کو مجموعی طور پر یکجا کر کے اسے اپنے جذبۂ شعور کے نہاخانوں سے گزار شعر کے قالب میں ڈھالنے پر اصرار پروازی کی غزلوں میں کئی جگہ ملتا ہے۔

عبدالاحد ساز، بمبئی

جو چوٹ دے گئے اسے گہرا تو مت کرو
ہم بے وقوف ہیں کہیں چرچا تو مت کرو

مانا کہ تم نے شہر کو سر کر لیا مگر
دل جا نماز ہے اسے رستہ تو مت کرو

با اختیارِ شہر ستم ہو یہ شک نہیں
لیکن خدا نہیں ہے یہ دعوا تو مت کرو

برداشت کر لیا چلو باریک پیرہن
پر اسکو جان کر کے بھگویا تو مت کرو

تعمیر کا جنون مبارک تمہیں مگر
کاریگروں کے ہاتھ تراشا تو مت کرو

فکروفن کے تقاضوں کے مطابق اس نے اپنی ایک الگ راہ بنانے کی سعی کی۔ شعر کے پہلے مصرعے میں خلق کی ہوئی دقیق فضا کو دوسرے مصرعے یا کسی ایک لفظ کے ذریعے تہس نہس بھی کر دیتی ہے۔

پروفیسر عتیق اللہ۔ دہلی

ایک پاگل ہے جو دن بھر یہی چلاّتی ہے
میرے بھارت کے لئے کون سی "بس" جاتی ہے

اپنی بستی میں شناور ہی نہیں ہے کوئی
ہر طرف ڈوبنے والوں کی صدا آتی ہے

صاف گوئی کی بھی تہذیب ہوا کرتی ہے
ایسی باتوں سے تو بارات پلٹ جاتی ہے

تنہا رہنے کا سبب ہو تو بہت گہرا ہو
ورنہ تنہائی بھی کردار سے گِر جاتی ہے

شہرِ محروم میں ہم تجھکو کہاں رکھّیں گے
تو تو اُمید ہے اس شہر میں کیوں آتی ہے



اظہار میں محض بیان نہیں ہے بلکہ جہاں بیان کا دھوکا ہے وہاں بھی اس کی تہہ میں کوئی نہ کوئی الم ناک پہلو ایسا جاگزیں ہوتا ہے جو ہمارے اطمینان کو،، بھک،، سے اڑا دیتا ہے۔

پروفیسر عتیق اللہ۔ دہلی

بتا کیا دیر ہے آب و ہوا ہموار کرنے میں
تجھے کتنا لہو اور چاہیئے اقرار کرنے میں

امیر کارواں تم بھی پسِ دیوار رہتے ہو
تمہارا نام بھی آتا ہے خنجر دھار کرنے میں

عدالت میں تو حُلیہ دیکھ کر انصاف ہوتا ہے
تمہیں برسوں لگیں گے یہ سمندر پار کرنے میں

یہ گُل پوشی یہ سرکاری کنیزیں اور یہ مسند
کلیجہ چاہیئے سب چھوڑ کر انکار کرنے میں

ہمارے یہ سیاست داں ستمگر ہوں کہ چارہ گر
بہت مشاق ہوتے ہیں سیاسی وار کرنے میں

خلاصہ یہ کہ تم نے بھی کہاں سونے دیا جاناں
تمہارا بھی تو حصّہ ہے ہمیں ہشیار کرنے میں

ان کی شاعری دھندلے مبہم اور پکڑ میں نہ آتے ہوئے تجربوں کے گنجلک اظہار کا چیستان نہیں بنتی ہے۔

عبدالاحد ساز بمبئی

## ''بشیر بدر کی نذر''

فردِ باطل کا مددگار بھی رَد ہوتا ہے
پستہ قد بر سِر مینار بھی رَد ہوتا ہے

تم تو فنکار ہو ظالم کا قصیدہ نہ لکھو
اِس سے الفاظ کا، کردار بھی رَد ہوتا ہے

حرمتِ فن کی حفاظت ہے تمہارے ذمّے
جھوٹی تعریف سے فنکار بھی رَد ہوتا ہے

شر نگاری سے اُخوّت کا تصوّر ہی نہیں
محترم آپ کا اخبار بھی رَد ہوتا ہے

کیا یہاں پھول کی خوشبو نہیں جانی جاتی
کیا یہاں چاند کا آکار بھی رَد ہوتا ہے

اب آپ مختلف سے بہت آگے نکل چکے ہیں۔ آپکی تازہ غزلیں
اور مختلف کے درمیان ایک خلاء سا محسوس ہوتا ہے۔

سہیل اختر بھونیشور۔

عذاب وقہر ہوکر بھی تہیہ محراب آتے ہیں
یہاں تک خشک ہونے کو کئی سیلاب آتے ہیں

یہ وہ فہرست ہے جو شام تک پرچم جھکا دے گی
مگر وہ لوگ جن کو دشت کے آداب آتے ہیں

یہ مانا زندگی اس رُخ پہ خنجر پار کرتی ہے
مگر اس کھیل میں خطّے بڑے شاداب آتے ہیں

تری آنکھوں کی گہرائی مکمل آشیانہ ہے
یہاں تک تو پرندے بھی بہت بے تاب آتے ہیں

مرے اسلوب کی جن کو ذرا بھی جانکاری ہے
اُنہیں یہ بھی پتہ ہوگا کہاں اعراب آتے ہیں

انہوں نے اپنی ذہانت اور اظہاری صلاحیت کو، اپنی بات اپنے ڈھنگ سے کہنے پر مرتکز کیا ہے

عبدالاحد ساز بمبئی

کسی کو حق نہیں ہے صاحب خوش نام رکھّیں گے
یہ رسمِ رُونمائی ہے اِسے حُکّام رکھّیں گے

چلو فرمانروائے وقت اپنی خستہ حالی پر
بنامِ مُلک بہرِ قوم اِک پیغام رکھّیں گے

تمہاری عمر کی مدّت سے مستقبل گھٹا دیں گے
پھر اُس پر صبر کرنے کے لئے انعام رکھّیں گے

زمیں کا ایک ٹکڑا رہ گیا ہے زخم کی صورت
اگر یہ بھی نکل جائے تو جشنِ عام رکھّیں گے

بطرزِ فن اگر ابہام رکھّیں گے تعلق میں
بطورِ استعارہ آپ ہی کا نام رکھّیں گے

پروازی صاحب کھردرے لفظوں کو برتنے میں مہارت رکھتے ہیں، کئی اشعار دل کو چھو گئے۔۔
بسمل عارفی، سمستی پور۔

کچھ فیصلہ ہونے کی گھڑی آئی تو اب ہے
یہ رات میرے صبر سے ٹکرائی تو اب ہے

اس دشت میں ہم جیسا مسافر ہی کہاں تھا
تنہائی سے الجھی ہوئی تنہائی تو اب ہے

صحراؤں میں جھنکار کا اِمکان ہی کب تھا
زنجیر مرے پانو میں پہنائی تو اب ہے

اے گرمئ شمشیر پس وپیش نہ کرنا
کہتے ہیں جسے حوصلہ افزائی تو اب ہے

مِٹّی سے نکلنے کی تمنّا ہی کسے تھی
اِک ڈھونڈنے والے کی صدا آئی تو اب ہے



کمال کونہ تو یہ فکر ہے کہ بیان کو بندِش نگل جائے گی اور نہ ہی اُنہیں الفاظ کے نگر کا پتہ ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ الفاظ گویا خود بخود نئے نئے پیکر میں اُترتے چلے آتے ہیں۔

سُبھاش گوڑ

معصوم تھا حریف کے لشکر میں آ گیا
شہزادہ اِک کنیز کے چکّر میں آ گیا

کیا علم تھا کہ چاند میں پڑ جائیگا نشاں
یہ حُسنِ اتفاق تھا ٹھوکر میں آ گیا

اُس آفتابِ شہر کو اُردو زبان میں
آداب کہہ دیا تو مرے گھر میں آ گیا

منڈی گیا تھا اپنے دریدہ لباس میں
جب لُٹ گیا تو قیمتی چادر میں آ گیا

گھر کی ضروریات کا اتنا دباؤ تھا
چھٹی کا روز بھول کے دفتر میں آ گیا

احمد کمالؔ پروازی کی شاعری زندگی کے نشیب وفراز، تلخ وترش، تجربوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے
یہ درد وسوز کی ایسی دولت ہے جو ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی
پروفیسر عظیم الشان صدیقی

پتّی کو پھول، پھول کو گجرا نہیں کیا
ظالم نے پورے گانو کا دورہ نہیں کیا

جب سے سمجھ میں آیا کہ ہم بھی ہیں آدمی
اُس دن سے آدمی پہ بھروسہ نہیں کیا

قلّاش ہونے آئے تھے قلّاش ہو گئے
اچھّا نہیں کیا تو جا اچھّا نہیں کیا

یہ رُخ نئے شعار کی تمہید تو نہیں
کیا بات ہے سلام وغیرہ نہیں کیا

گو خاک ہوں نہ کوئی ستم یافتہ کسان
پر اِسکے بعد بھی کبھی غُصّہ نہیں کیا

مریضانہ روایتی عشقیہ مضامین اور روایتی لب ولہجہ سے محفوظ رہ کر ان کی غزل زندگی سے آنکھ ملانے کی جرائت کرسکتی ہے، احمد کمال پروازی فطری اور سچے شاعر ہیں ،،

پروفیسر عظیم الشان صدیقی دہلی،

چاک سینے کی اِک مشین کا ہے
مسئلہ گھر کی آستین کا ہے

جو ہمکتا ہے چاند کی صورت
اِستعارہ اسی زمین کا ہے

شہر یوں ہی لرز نہیں جاتے
یہ عمل بھی کسی حسین کا ہے

جس میں چاہوں گا ڈوب جاؤں گا
ہر سمندر مرے یقین کا ہے

اُٹھ گئی رات میکدے والی
سامنا اب مخالفین کا ہے

کیا کروگے کمالِ پروازی
قافیہ ایک مہ جبین کا ہے

ان کے یہاں دبا دبا غصہ عصری ناہمواریوں پر جاندار تخلیقی حملہ ہے۔
اسکے بیشتر اشعار قاری کی فہم کو للکارتے ہیں، مصوّر سبزواری ایوان اردو۔ دہلی

مسافت کے علاوہ دوسرا تمغہ نہیں لگتا
اگر تم ساتھ ہوتے پانو میں کانٹا نہیں لگتا

کسی حصّے پہ کچھ چاندی برس جانا ضروری ہے
مجھے مقصد سے عاری تجربہ اچھا نہیں لگتا

بہت شفّاف دریا ہے مگر اس میٹھے پانی کے
کوئی دو گھونٹ پی لیتا تو یہ آدھا نہیں لگتا

وطن شاید کسی دن پھر مرے سینے سے لگ جائے
مگر وہ چاند پھر چمکے مجھے ایسا نہیں لگتا

یہاں کی کھڑکیاں روشن نہیں ہوتیں مسافر پر
یہ دروازہ ہے لیکن پھر بھی دروازہ نہیں لگتا

گوالیار میں آپ کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے لوگوں کو آپ کے
اشعار یاد ہو کر رہ گئے ہیں۔ شکیل گوالیاری

کوئی مُنہ زور بجلی ہاتھ میں آنے سے آتی ہے
مگر یہ بات آتی ہے تو مرجانے سے آتی ہے

گھڑی یوں ہی نہیں آتی خس وخاشاک اُڑنے کی
ترے شانے پہ تیری زلف لہرانے سے آتی ہے

ہزاروں لوگ ملنے پر بھی پیمانہ نہیں بھرتا
یہ بے چینی بہت آگے نکل جانے سے آتی ہے

اُجالے چھاننے سے اُنگلیاں روشن نہیں ہوتیں
یہ فنکاری کسی کا چاند چمکانے سے آتی ہے

یہ وہ حالت ہے جس پر خود بہ خود دروازے کُھلتے ہیں
تری خوشبو بھی خود مختار ہو جانے سے آتی ہے

سرزمینِ اجین کے صاحبِ طرز شاعر احمد کمال پروازی نے اپنی شعری وادبی کاوشوں سے بَرِ صغیر کے شعری حوالوں میں اس خِطّے کی شناخت قائم کرکے اپنی فکری وفنّی صلاحیتوں کا ثبوت دیا ہے۔

ڈاکٹر واجد قریشی۔ صدر شعبۂ اُردو کالیداس گورنمینٹ کالج اجین،

یہ توفیق محبت ہے جوانی بول پڑتی ہے
یہاں سنجیدگی بھی پانی پانی بول پڑتی ہے

شعورِ رنگ و بو حُسنِ مراسم اِسکو کہتے ہیں
اُنہیں آواز دوں تو رات رانی بول پڑتی ہے

بدن کی خوش کلامی کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں
ادھورے پیرہن سے بدزبانی بول پڑتی ہے

مقامِ کربلا سے جب کوئی پیاسا گزرتا ہے
سُنا ہے نہر کی تشنہ دہانی بول پڑتی ہے

ہم اپنی صاف گوئی سے کبھی چوُکا نہیں کرتے
طبیعت میں کسانی ہے کسانی بول پڑتی ہے

احمد کمال پروازی اسی عہد کے شاعر ہیں اسلئے ان کی عصری حسیت جب ذات کے حوالے سے اپنے دور کی خونچکاں داستاں رقم کرتی ہے تو انکے یہاں بھی درد وغم کی لے تیز ہو جاتی ہے۔

پروفیسر عظیم الشان صدیقی دہلی

مزاج یار میں کچھ ہیر پھیر کرنا ہے
چراغِ شام جلانے میں دیر کرنا ہے

کٹائی ہونے لگی ہے ہرے درختوں کی
جواز یہ ہے کہ دشمن کو زیر کرنا ہے

کسے خبر تھی کبھی واپسی نہیں ہوگی
بتا کے آئے تھے گھر پہ کی سیر کرنا ہے

وہ کام میرے قبیلے کے ذمّے کر دینا
جو کام آنکھ اُٹھائے بغیر کرنا ہے

الگ محاذ پہ ہوں میری واپسی کیسی
مجھے تو ظلِّ الٰہی کو زیر کرنا ہے

زندگی کی ناہمواریوں سے الجھنا پروازی کا مزاج بن چکا ہے۔
مصور سبزواری ایوان اردو۔ دہلی

ہاتھ تھامے ہوئے رکھنا کہ بھٹک جاتا ہے
یہ ابھی پاؤں سے کمزور ہے تھک جاتا ہے

میری درخواست پہ اتنا نہ بھروسہ کرنا
لکھتے لکھتے بھی مرا ذہن بھٹک جاتا ہے

کھوجنے جب بھی نکلتا ہوں ستم گر کا نشاں
اپنی ٹوٹی ہوئی دیوار پہ شک جاتا ہے

کتنا جاں دار ہے یہ رشتہ شناسی کا سفر
ایک مجذوب بھی زنجیر تلک جاتا ہے

ناقدِ شعر اِسے جوشِ نُمو کہتے ہیں
یہ وہ عالم ہے کہ پتّھر بھی سرک جاتا ہے

گوالیار میں آپ کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے لوگوں کو آپ کے
اشعار یاد ہو کر رہ گئے ہیں۔ شکیل گوالیاری

## ”مرحوم عرفان صدّیقی کی نذر“

اندھیری شب میں اُجالے کو عام کرتے ہوئے
میں بجھ گیا ہوں چراغوں پہ کام کرتے ہوئے

شِکست کھائی تو اک طنز کر کے لوٹ آیا
تمام شہر فرشتوں کے نام کرتے ہوئے

میں مستحق ہوں مگر اے ادائے درویشی
میں مطمئن ہوں ترا احترام کرتے ہوئے

اَنا کا بوجھ بھی رکھّا ہے میرے شانے پر
یہ ہاتھ کانپ رہا ہے سلام کرتے ہوئے

بساطِ جاں میں اُترنے لگے ہیں سنّاٹے
بچھڑ رہا ہے کوئی شب تمام کرتے ہوئے

طویل و عریض کرۂ ارض پر ایک چھوٹے سے مامن کی تلاش اسکے یہاں گھر کا استعارہ بن کر ابھری ہے۔ڈاکٹر صادق۔ دلّی یونیورسٹی۔

یہ لگ رہا ہے رگِ جاں پہ آ کے چھوڑی ہے
کسی نے آگ بہت پاس لا کے چھوڑی ہے

گھروں کے آئینے صورت گنوا کے بیٹھ گئے
ہوا نے دھول بھی اوپر اُٹھا کے چھوڑی ہے

یہ اب کھُلا کہ اسی میں میری نجات بھی تھی
جو چیز میں نے بہت آزما کے چھوڑی ہے

ہوا کا جبر کہیں بیچ میں تھا ہی نہیں
تری گلی بھی بہت دل دکھا کے چھوڑی ہے

کمالؔ دیکھنا یہ خیمۂ حُسین تھا کیا
کسی نے دل میں کوئی شے جلا کے چھوڑی ہے



احمد کمال پروازی، روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے تمام واقعات ورجحانات کوفن کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔ اورانہیں کھوٹے کھرے کی کسوٹی پر، پرکھ کرشعر کی شکل میں پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔

نوشاد احمد کریمی۔ بہار۔

پہچان میں آنے کا ہنر ساتھ میں رکھنا
کتنا ہی اُجالا ہو دیا ہاتھ میں رکھنا

ان دیکھے ستارے بھی مرے دیکھے ہوئے ہیں
مرے لئیے رکھو تو سفر رات میں رکھنا

اِس بار مجھے پاس گریباں بھی نہیں ہے
اِس بار سبھی فیصلے برسات میں رکھنا

سرگوشیاں کرتے ہوئے پیڑوں کی زمیں ہو
گاتی ہوئی کشتی بھی ملاقات میں رکھنا

سر کرنا اکیلے ہی سمندر کی طوالت
مل جائے کوئی ناؤ تو خطرات میں رکھنا



اظہار میں محض بیان نہیں ہے بلکہ جہاں بیان کا دھوکا ہے وہاں بھی اس کی تہہ میں کوئی نہ کوئی الم ناک پہلو ایسا جاگزیں ہوتا ہے جو ہمارے اطمینان کو،، بھک،، سے اڑا دیتا ہے۔

پروفیسر عتیق اللہ۔ دہلی

جانے پہچانے رویّے کی طرح لگتا ہے
تو بھی دل توڑنے والے کی طرح لگتا ہے

اب اُسے چھوڑ کے ہجرت بھی نہیں ہو سکتی
وہ مرے پاؤں کے چھالے کی طرح لگتا ہے

غم کی سچّائی کو آنکھوں سے ادا مت کرنا
اب تو رونا بھی دکھاوے کی طرح لگتا ہے

تو میرا یار ہے لیکن میری اُلجھن یہ ہے
تو بھی سرکاری ادارے کی طرح لگتا ہے

ظلِّ سبحانی کا اعزاز نوازی کا عمل
سوچے سمجھے ہوئے سودے کی طرح لگتا ہے

میں پہلے کہہ چکا ہوں جس قسم کی غزل کہی جا رہی ہے یہ ہر لحاظ سے اس سے مختلف ، مختلف غزلوں کا مرقع ہے۔ ۔آزاد گلاٹی ۔ نابھ

جو گُل دستے تمہارے سامنے ہیں
انہیں سُنا یہ مُنہ سے بولتے ہیں

ہوائے صبح پانی چھینٹتی ہے
اُجالے آکے کمرہ کھولتے ہیں

خطوں میں اب بھی کوئل بولتی ہے
ہمارے نام کے پتّے ہرے ہیں

وہ خوش صورت تو پہلے بھی بہت تھا
اب آتش دان روشن ہو گئے ہیں

وہ پہلے بھی کسی چھت میں نہیں تھا
اب اُس پر اور جنگل کھُل گئے ہیں

ان اشعار کا خالق کوئی معمولی تخلیق کار نہیں ہوسکتا ۔ عبدالمتین نیاز

بغیر شرط حدیں توڑ کر نکلتا ہے
یہ وہ چراغ ہے جو اپنے آپ جلتا ہے

اُسے خبر ہے کہ دل کی بساط چھوٹی ہے
مگر وہ اب بھی ستاروں کی چال چلتا ہے

یہ شخص ساعتِ امکاں پہ کیسے پہنچے گا
سفر کی سمت نہیں کشتیاں بدلتا ہے

یقین اُسکو کہا جائے جو مصیبت میں
بطورِ خاص صفیں کاٹ کر نکلتا ہے

کئی دنوں سے مرے کاروبار کا سورج
ترے مکان کی دیوار سے نکلتا ہے

زندگی کی ناہمواریوں سے الجھنا پروازی کا مزاج بن چکا ہے۔

مصور سبزواری ایوان اردو۔ دہلی

وہ شریعت کے اختیار میں تھا
اور میں شِدّتِ بخار میں تھا

چھوڑ کر کھیل کیسے ہٹ جاتا
میں جُواری تھا اور ہار میں تھا

یہ تو تھی انکی ضربتِ کاری
اور جو صبر خاکسار میں تھا

کیا عجب چیز تھی یہ بر بادی
آنکھ جھپکی تو سبزہ زار میں تھا

بے وقوفوں کا اِک جُلوس سا تھا
اور میں بھی اُسی قطار میں تھا



کمال کو نہ تو یہ فکر ہے کہ بیان کو بندِش نگل جائے گی اور نہ ہی اُنہیں الفاظ کے نگر کا پتہ ڈھونڈ نا پڑتا ہے۔ الفاظ گویا خود بخود نئے نئے پیکر میں اُترتے چلے آتے ہیں۔
سُبھاش گوڑ

شعورِ گمرہی اندھا نہیں ہے
تو دلبر ہے مرا آقا نہیں ہے

یہ کٹ کر خود بھی قاتل ہو گئے ہیں
تمہیں پیڑوں کا اندازہ نہیں ہے

میں اپنے آپ اُن سے کٹ گیا ہوں
یہ روزہ ہے کوئی فاقہ نہیں ہے

مجھے تشویش ہے تو صرف اتنی
مرا بچّہ کبھی روتا نہیں ہے

ستارے تو شریکِ شب ہیں لیکن
ہمارا ہی نمائندہ نہیں ہے



ملک کے اس بے حجاب دور کو شاعر نے الگ الگ نظریے سے دیکھا ہے۔ اور اپنی تمام بے چینی اور بے بسی نہایت چھوٹی سی بحر میں سلیس انداز سے بیان کر دیا ہے۔

سُبھاش گوڑ

جس سے ڈرتا ہوں وہی آب و ہوا ملتی ہے
ہر جگہ ہوش میں آنے کی دوا ملتی ہے

میں تری زلفِ دل آویز سے لیتا ہوں مُراد
جب یہ کہتا ہوں درختوں سے ہوا ملتی ہے

کام تو دن میں بھی ہوتے ہیں مگر ہمعصرو
آخرِ شب بڑی شفّاف فضا ملتی ہے

ڈر تو لگتا ہے مگر رات کے سنّاٹے میں
خشک پتّوں کو کھڑکنے کی ادا ملتی ہے

مسئلہ یہ ہے کہ سنسان حویلی میں ہمیں
اِک دیا روز جلانے کی سزا ملتی ہے

کتنے خوش بخت وہ مجرم ہیں گھروں پر جنکو
رات میں دیر سے آنے کی سزا ملتی ہے

کمال مختلف کے اشعار اگر انتخاب کرنے لگوں تو شاید ہی کوئی شعر چھوڑنے کے قابل ہو۔
سُبھاش گوڑ

کبھی بھی آئیں دِل داری ابھی ہو
اُنہیں آنے سے پہلے راستہ دو

وہی رفتار دِل پر دستکوں سی
مجھے معلوم ہے یہ تم نہیں ہو

تری خواہش سے اُوپر اُٹھ رہا ہوں
یہی لمحہ نتیجہ ہوگیا تو

وہی عالم ہے شہرِ زندگی کا
چلو تو دور تک مِٹّی اُڑا دو

ابھی تو رسمِ آمد چل رہی ہے
کہاں جاتے ہوائے خانہ بدوشو

طویل وعریض کرۂ ارض پر ایک چھوٹے سے مامن کی تلاش اسکے یہاں گھر کا استعارہ بن کر ابھری ہے۔ڈاکٹر صادق۔ دلّی یونیورسٹی۔

غیر محفوظ گریبان سا ہو جاتا ہوں
تیرے گھر آکے پشیمان سا ہو جاتا ہوں

تجربہ کر کے کوئی بار اُٹھاتے کیوں ہو
میں تو ویسے ہی پریشان سا ہو جاتا ہوں

میں کسی کھیل میں شرکت نہیں کرتا پھر بھی
دام آتا ہے تو حیران سا ہو جاتا ہوں

میری مٹّی میں وہ تاثیر کہ ہر آخرِ شب
خود بخود ٹوٹ کے نقصان سا ہو جاتا ہوں

میں اگر اپنے ہی اُسلوب کے معیاروں سے
گر بھی جاتا ہوں تو رُجحان سا ہو جاتا ہوں



مجموعے میں دیہی معاشرت کی پیوند کاری اِسکے تنوع میں اضافے کا سبب بن جاتی ہے۔

پروفیسر عظیم الشان صدیقی دہلی،

محوروں کو جب بھی اپنی زد پہ لے آتا ہے وہ
سانس لینے کا عمل منسوخ کر جاتا ہے وہ

جب بھی اپنے پاؤں پہ چلنے کی ضد کرتا ہوں میں
سر سے اونچے پانیوں کی شرط دہراتا ہے وہ

بزمِ یاراں توڑ دینے میں بہت مشّاق ہے
ایسا سُنتے ہیں پسِ دیوار ہو جاتا ہے وہ

اُسکے اندر اشک بن جانے کی گنجائش بھی ہے
اِک کرن پڑتے ہی کتنا جگمگا جاتا ہے وہ

سر زمینوں سے وراء لمبا سفر کیسے کریں
بے طلب، بے سمت، بے آواز بھٹکا تا ہے وہ

کمال کسی ایک کیفیت پر قانع نظر نہیں آتا۔ وہ لمحات کی چنی ہوئی دیوارِ وقت کے
ادھر ادھر دو طرف دیکھتا ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ۔ دہلی،

جذبۂ شوق کی دہائی بھی ہے
کیا کروں ضبط آزمائی بھی ہے

ساعتِ زندہ باد آئی بھی ہے
میں نے خوشبو انھیں دکھائی بھی ہے

پورے ہوش و حواس میں ہم نے
رسمِ دیوانگی نبھائی بھی ہے

قطرے قطرے سے دل دکھا ہے مرا
میں نے برسات آزمائی بھی ہے

میں تیرا حسن چھو کے دیکھوں گا
اس میں تحقیق کی بھلائی بھی ہے

غزل میں مختلف ہونا بڑے دل گردے کا کام ہے' لہجہ ذرا اونچا ہوا تو آواز پھٹ جاتی ہے اور دھیما ہوا تو دوسری آوازوں میں گم ہو جاتا ہے لیکن خوشی کا مقام ہے کہ احمد کمال پروازی نے نہ تو اپنے لہجے کو پھٹنے دیا ہے اور نہ ہی انکی آواز دوسری آوازوں میں گم ہوئی ہے۔،

ڈاکٹر محمد حسن عصری ادب دہلی۔

میرا بس ہو تو تری شب کا مداوا ہو جاؤں
تو اگر سیر کو نکلے تو سویرا ہو جاؤں

تیری خوشبو تری سج دھج میں اضافہ کر دوں
پھول بن جاؤں ترے ہاتھ کا گجرا ہو جاؤں

تو نہ آئے تو مری جان میں پانی نہ پیوں
دوسرے روز بھی کھینچا ہوا روزہ ہو جاؤں

جی میں آتا ہے اُسی قامت وقد کی خاطر
پھر وہیں جاؤں اُسی عمر کا لڑکا ہو جاؤں

جس بیاباں کی طرف شامِ وطن کا رخ ہے
اُس طرف میں بھی نکل جاؤں تو بوڑھا ہو جاؤں

غم کا احساس نہیں ہے تو ادھورا پن ہے
ایک آنسو بھی ٹپک جائے تو پورا ہو جاؤں



غزل کی بساط میں گاؤں اور اس کی زندگی کو پورے شاعرانہ رکھ رکھاؤ کے ساتھ
ادا کرنے کی کوشش بڑے حوصلے کی بات ہے۔

پروفیسر عتیق اللہ۔ دہلی

تم پہ سورج کی کرن آئے تو شک کرتا ہوں
چاند دہلیز پر رک جائے تو شک کرتا ہوں

میں قصیدہ ترا لکھوں تو کوئی بات نہیں
پر کوئی دوسرا دہرائے تو شک کرتا ہوں

اُڑتے اُڑتے کبھی معصوم کبوتر کوئی
آپکی چھت پہ اُتر آئے تو شک کرتا ہوں

پھول کے جھنڈ سے ہٹ کر کوئی پیاسا بھنورا
تیرے پہلو سے گزر جائے تو شک کرتا ہوں

"شیو" تو ایک تراشی ہوئی مورت ہیں مگر
تو اُنہیں دیکھ کے شرمائے تو شک کرتا ہوں



کمال نے ذات کو کم ہی مسئلہ بنایا ہے، اسے تو اپنی انا کو بسیط آفاق میں پھیلانے میں طمانت حاصل ہوتی ہے۔
پروفیسر عتیق اللہ۔ دہلی

کلی بھنورے پہ جھکتی ہے تو شرکت میں بھی کرتا ہوں
مری مجبوری یہ ہے کہ محبت میں بھی کرتا ہوں

روایت کا مجاوِر ہوں نہ قاضی کا نمائندہ
مگر سر پر دوپٹّے کی حمایت میں بھی کرتا ہوں

زمانے سب کو رد کردے مگر ماں باپ رہنے دے
یہ ایسے حرف ہیں جنکی تلاوت میں بھی کرتا ہوں

وہ جب خندق بچھاتے ہیں خود اپنے دستِ نازک سے
تو آنکھیں موند کر چلنے کی حسرت میں بھی کرتا ہوں

شعورِ حرف سے آگے مرا کردار چلتا ہے
سخنور ہوں مگر محنت مشقّت میں بھی کرتا ہوں

اکثر اوقات نیم لبی کی کیفیت بھی نمایاں ہوئی ہے، اظہار میں آئرنی کا فن بھی اُجاگر ہوا ہے۔

پروفیسر عتیق اللہ۔ دہلی

تیری شرکت سے ہر اک عیب نکل جاتا ہے
کڑوا پانی مرا شربت میں بدل جاتا ہے

حرف جب تیرے تصور میں بدل جاتا ہے
خود کشی کرنے کا ارمان نکل جاتا ہے

جب بھی آتا ہے تری جسم بھگونے کا خیال
ذہن میں ابر کا ٹکڑا سا مچل جاتا ہے

جیتے جی مرنے کی اِک ہوڑ سی لگ جاتی ہے
شہر جاناں میں تو نقشہ ہی بدل جاتا ہے

اب ترے نام سے میں جب بھی جلاتا ہوں چراغ
اِک چراغ اور مرے ہاتھ سے جل جاتا ہے

انہیں ان کے نمائندہ ہم عصروں میں آسانی سے پہچانا جاسکتا ہے

عبدالاحد ساز بمبئی

دل مدحتِ دلدار سے عاری تو نہیں ہے
یہ شعر ہے تنقید نگاری تو نہیں ہے

نایاب کوئی چیز گزرتی ہے تو ہم لوگ
یہ سوچنے لگتے ہیں ہماری تو نہیں ہے

زخموں کو کھُلا رکھنے کی عادت ہے ہماری
بس میں کوئی نمکین "سواری" تو نہیں ہے

تُم جیت تو آئے ہو مگر یہ نہیں سوچا
جو ہار گیا ہے وہ شکاری تو نہیں ہے

محفوظ تو ہے اب بھی مری تلخ کلامی
لہجے میں کہیں شُکر گزاری تو نہیں ہے



احمد کمال پروازی کے شعروں سے دو چیزیں بالکل واضح ہیں۔ ایک تو اشیاء و احساس کو ادا کرنے کا اس کا اپنا ایک شیوۂ خاص ہے، جو اسکے لفظوں کے غیر رسمی طریق استعمال سے ہویدا ہے، دوسرے یہ کہ وہ ہر بات میں کوئی ایسی بات نکالتا ہے جو ایک دم معمول کو مسترد بھی کرتی ہے۔ - پروفیسر عتیق اللہ۔ دہلی

عمل بروقت ہونا چاہیئے تھا
زمیں نم تھی تو بونا چاہیئے تھا

سمجھنا تھے مجھے بارش کے معنی
تمہیں کپڑے بھگونا چاہیئے تھا

تو جادو ہے تو کوئی شک نہیں ہے
میں پاگل ہوں تو ہونا چاہیئے تھا

میں مجرم ہوں تو مجرم اس لئے ہوں
مجھے سالم کھلونا چاہیئے تھا

میں تیشہ لیکے اکثر سوچتا ہوں
مجھے فرہاد ہونا چاہیئے تھا

اگر کٹ پھٹ گیا تھا مرا دامن
تمہیں سینا پرونا چاہیئے تھا

میرے موسم بھی ترے زیرِ اثر جاتے ہیں
زلف کھُلتے ہی مرے بال بکھر جاتے ہیں

اُن سے جب ہاتھ ملانے کی طلب ہوتی ہے
خود بخود ہاتھ سے دستانے اُتر جاتے ہیں

کوئے جاناں کی سیاحت کا بدل ہے ہی نہیں
اب وہاں گولیاں چلتی ہیں مگر جاتے ہیں

زہر کی اتنی ضرورت ہے مری جان کہ اب
جس طرف سانپ نکلتے ہیں اُدھر جاتے ہیں

حُسن جب ہم سے ملاقات کی ضِد کرتا ہے
اپنے خود ساختہ معیار اکھر جاتے ہیں

احمد کمال کے یہاں ماضی کی طرف مراجعت کا بھی ایک میلان نمایاں ہے
اس میلان کو نورومانیت کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ ۔ پروفیسر عتیق اللہ۔ دہلی

لہو کا وصف رنگِ زخم آنکھیں تر بھی دیکھیں گے
وہ منظر ہی نہیں آکر تہہ منظر بھی دیکھیں گے

نگار و نقش خال و خد اُنہیں سے ملتے جلتے ہیں
یہ بچہ خوبصورت ہے اسے چھوکر بھی دیکھیں گے

تمہارا حسن تو لفظوں کے معنی کھول دیتا ہے
تمہیں تو شہر کے معروف دانش ور بھی دیکھیں گے

سراپا چاند کا تسلیم لیکن اے جہاں آراء
جو اِس میں چھُپ کے بیٹھا ہے وہ کاریگر بھی دیکھیں گے

کہیں ایسا نہ ہو اِس روشنی میں قد ہی گھٹ جائے
ہم اِس اعزاز میں امکانِ خیروشر بھی دیکھیں گے

جب انکے شعر پڑھے تو معلوم ہوا کہ ان کی شاعری ان کی نثر سے زیادہ
خوبصورت اور فکر انگیز ہے۔ احتشام اختر کوٹہ

یہ بھی اچّھا ہے مگر اِس سے بھی اچّھا ہوتا
ساتھ چلتے تو اُجالے پہ اُجالا ہوتا

اُن سے کل ہاتھ ملانے کی تمّنا کی تھی
اور اب سوچ رہاہوں کہ مرا کیاہوتا

اُنکی شرکت کا تو عالم ہی عجب ہوتا ہے
باغ لٹ جاتے اگر واقعہ سچا ہوتا

خسروِشہر مرے ہاتھ پہ بوسہ دیں گے
کاش ایسے میں کوئی جاننے والا ہوتا

رات بھر جاگ کے سونے میں مزا آجاتا
میں اگر روشنی ہوتا تو ستارا ہوتا

کون کہتا ہے کہ دیوانے نہیں ہیں ہم لوگ
ایسا ہوتا تو یہ بازار ہمارا ہوتا



احمد کمال پروازی ایک باشعور اور حساس فنکار ہیں، وہ اپنے گردوپیش میں رونما ہونے والے واقعات وحادثات سے بے خبر نہیں رہتے۔ سیاسی سماجی مسائل کوانہوں نے اپنی غزل میں بڑی خوبصورتی سے سمولیا ہے۔ انکے اشعار میں درد واثر اور فکر کی تہہ داری پائی جاتی ہے ،، احتشام اختر کوٹہ

برائے زیب اُس کو گوہر و اختر نہیں لگتا
وہ خود اِک چاند ہے اور چاند کو زیور نہیں لگتا

خدایا یوں بھی ہو کہ اُس کے ہاتھوں قتل ہو جاؤں
وہی اِک ایسا قاتل ہے جو پیشہ ور نہیں لگتا

اگر عارض پرستی کا عمل اک جرم بنتا ہے
سزا بھی کاٹ لیں گے کاٹنے سے ڈر نہیں لگتا

محبت تیر ہے اور تیر باطن چھید دیتا ہے
مگر نیت غلط ہو تو نشانے پر نہیں لگتا

رئیسِ شہر ہو کر بھی وہ اتنا جھک کے ملتا ہے
کہ اُس کے سامنے کوئی بھی قد آور نہیں لگتا

احمد کمال پروازی نے یہ ثابت کیا کہ اردو غزل دیہاتی زندگی کے مسائل
اور معاملات سے بخوبی واقف ہے۔ رشید قریشی نیا دور لکھنو

وہ اب تجارتی پہلو نکال لیتا ہے
میں کچھ کہوں تو ترازو نکال لیتا ہے

وہ پھول توڑے ہمیں کوئی اعتراض نہیں
مگر وہ توڑ کے خوشبو نکال لیتا ہے

میں اِس لیے بھی ترے فن کی قدر کرتا ہوں
تو جھوٹ بول کے آنسو نکال لیتا ہے

اندھیرے چیر کے جگنو نکالنے کا ہنر
بہت کٹھن ہے مگر تو نکال لیتا ہے

وہ بے وفائی کا اظہار یوں بھی کرتا ہے
پرندے مار کے بازو نکال لیتا ہے



صرف ۵۵۔غزلوں پر مشتمل احمد کمال پروازی کا شعری مجموعہ دو، دو، تین تین سو صفحات کے شعری مجموعوں کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔اور اسی لئے ہر دور میں مختلف رہے گا
رشید قریشی نیا دور لکھنو

اک عُمر کا حساب تھا کل لے کے آئے تھے
وہ بے نقاب رات کا حل لے کے آئے تھے

اِس بار ابر ردّعمل لے کے آئے تھے
تیرے لیئے گلاب کا جل لے کے آئے تھے

سرحد کے پاسبان نے جُرمانہ لے لیا
ہم آگرے کا تاج محل لے کے آئے تھے

ویسے تو امتحان تھا علم الحساب کا
پر ہم جواب دینے غزل لے کے آئے تھے

تو تو وطن ہے اپنا ہی ثانی نہیں ملا
کچھ بے وقوف تیرا بدل لے کے آئے تھے

انکی شاعری کا لہجہ کسی قدر دھیما ضرور ہے لیکن آہنگ بلند ہے۔
جو انہیں دوسرے شعراء سے مختلف بنا دیتا ہے۔ پروفیسر عظیم الشان صدیقی دہلی،

بساطِ جاں سے ساری رات طیّارے نکلتے ہیں
کبھی یوں بھی دھواں اُٹھتا ہے انگارے نکلتے ہیں

کئی شب جاگنے کے بعد اب جامہ تلاشی میں
ہماری جیب سے ٹوٹے ہوئے تارے نکلتے ہیں

اگر یہ دیکھنا ہے کیسا لگتا ہے قطاروں میں
یہاں بیٹھو اِسی رستے سے بنجارے نکلتے ہیں

جنوں کے موڑ پر اِس شہرِ تنہائی کے ساحل پر
یہی پُل ہے جہاں سے ہجر کے مارے نکلتے ہیں

مگر اب تو تری دہلیز وہ تاثیر رکھتی ہے
کہ جب بھی پانو رکھتا ہوں تو انگارے نکلتے ہیں



احمد کمال پروازی روزمرّہ کی زندگی اور اِردگرد کے ماحول سے مواد اخذ کرتے ہیں۔ انکی شاعری میں عام زندگی اور اِسکی تہذیب و معاشرت کا رنگ گہرا نظر آتا ہے۔

پروفیسر عظیم الشان صدیقی دہلی،

عجب موسم میں بے آہنگ و بے بنیاد آتا ہے
وہ ایسا شخص ہے جو بارشوں کے بعد آتا ہے

فضائے کوچہ جاناں نہ وہ رنجش کی سرگرمی
یہاں تو جو بھی آتا ہے پئے امداد آتا ہے

کہ جب صحرا کی لامحدودیت رستہ نہیں دیتی
سرِ شانہ کسی کا دستِ زندہ باد آتا ہے

یہ خوش ہونے کی باتیں ہیں کھٹکتا ہے مگر کانٹا
سفر سے جب بھی وہ آسودہؑ و دلشاد آتا ہے

وہ کل تک یاد آتا تھا تو میری ذمّے داری پر
مجھے یہ دیکھنا ہے آج کیسے یاد آتا ہے

انکی شاعری بے جا تصنع و تکلف سے اور مبالغہ آرائی سے محفوظ رکھتی ہے۔
جسکی وجہ سے اِسکی سادگی اور لطافت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔
پروفیسر عظیم الشان صدیقی دہلی،

تمہیں چھو کر توانائی عجب محسوس کرتا ہوں
میں صندل ہو کے جلنے کی طلب محسوس کرتا ہوں

میں اپنے ہاتھ میں یہ ہاتھ جب محسوس کرتا ہوں
تو اپنے آپ کو اعلیٰ نسب محسوس کرتا ہوں

مجھے تھوڑی سی خوشبو دیکے صحراؤں میں بھٹکا دے
میں پاگل ہو کے جینے میں سبب محسوس کرتا ہوں

جو پھولوں کے بجائے اُنکے رخساروں کو چھوتی ہے
میں ایسی دو پہر کو بے ادب محسوس کرتا ہوں

گلہ تو کیا مگر اے زندگی تیرے تعاقب میں
میں کیا کیا چھوڑ آیا ہوں یہ اب محسوس کرتا ہوں

احمد کمال پروازی کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے
کہ روایتی غزل سے بغاوت کرنے والوں میں ایک نام درج ہوا
رشید قریشی نیا دور لکھنو

یہ کیا کم ہے کہ حقِ خود پرستی چھوڑ دیتا ہوں
تمہارا نام آتا ہے تو کرسی چھوڑ دیتا ہوں

خود اپنے ہاتھ سے رسمِ وداعی کرتو دی پر اب
کوئی بارات آتی ہے تو بستی چھوڑ دیتا ہوں

تمہارے وصل کا جس دن کوئی امکان ہوتا ہے
میں اُس دن روزہ رکھتا ہوں برائی چھوڑ دیتا ہوں

حکومت مل گئی تو اُن کا کوچہ چھوٹ جائیگا
اِسی نقطے پر آ کر بادشاہی چھوڑ دیتا ہوں

مبارک ہو تجھے صد آفریں اے شانِ محرومی
تیرے پہلو میں آ کے گھر گرہستی چھوڑ دیتا ہوں

انکی شاعری میں ربیع خریف کی فصلوں کے تذکرے اور اپنے مقصد کے حصول کی آرزوئیں بارش ہونے کی
امیدیں سیلاب کی قیامت خیزی اور گھروں کی تباہی وغیرہ کی عکاسی دیہی
زندگی سے شاعر کے گہرے رشتے کا ثبوت ہے
رشید قریشی نیا دور لکھنؤ

تمام بھیڑ سے آگے نکل کے دیکھتے ہیں
تماشہ بین وہ چہرہ اُچھل کے دیکھتے ہیں

نزاکتوں کا یہ عالم کہ رونمائی کی رسم
گلاب باغ سے باہر نکل کے دیکھتے ہیں

تو لاجواب ہے سب اتفاق کرتے ہیں
مگر یہ شہر کے فانوس جل کے دیکھتے ہیں

اُسے میں اپنے شبستاں میں چھو کے دیکھتا ہوں
وہ چاند جس کو سمندر اُچھل کے دیکھتے ہیں

جو کھو گیا ہے کہیں زندگی کے میلے میں
کبھی کبھی اُسے آنسو نکل کے دیکھتے ہیں

جو روز دامنِ صد چاک سیتے رہتے ہیں
تمھیں وہ عید پہ کپڑے بدل کے دیکھتے ہیں

احمد کمال پروازی کی شاعری اپنے ہم عصروں سے مختلف اور منفرد ہے۔ انکے یہاں نہ تو مضامین کی تکرار ہے اور نہ زبان کی یکسانیت اور یک رنگی، یہ وجہ ہے کہ احمد کمال پروازی کی غزلیں قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ احتشام اختر کوٹہ

پھول پر اوس کا قطرہ بھی غلط لگتا ہے
جانے کیوں آپ کو اچّھا بھی غلط لگتا ہے

مجھکو معلوم ہے محبوب پرستی کا عذاب
دیر سے چاند نکلنا بھی غلط لگتا ہے

آپکی حرف ادائی کا یہ عالم ہے کہ اب
پیڑ پر شہد کا چھتّا بھی غلط لگتا ہے

ایک ہی تیر ہے ترکش میں تو عجلت نہ کرو
ایسے موقعے پہ نشانہ بھی غلط لگتا ہے

شاخِ گل کاٹ کے ترشول بنا دیتے ہو
کیا گلابوں کا مہکنا بھی غلط لگتا ہے

ڈھیر سارے مجموعوں میں کچھ عرصے قبل مجھے ایک شعری مجموعہ ایسا ملا جو سب سے مختلف تھا واضح رہے مجموعے کا نام بھی یہی ہے۔ احتشام اختر کوٹہ

میں نکتہ بھول جاتا ہوں تو مکتب کھول دیتی ہے
تری خوش قامتی حرفوں کا مطلب کھول دیتی ہے



میں جب بھی شہرِ امکانات سے واپس پلٹتا ہوں
تو اک مُنہ زور ساعت گیسوئے شب کھول دیتی ہے



میں خود بھی معترف ہوں پھول کی فنّی نزاکت کا
مگر اک نُقص ہے جو سرخیٔ لب کھول دیتی ہے

ابھی تک تو گہر افروز وہ لمحہ نہیں آیا
جہاں آنسو ٹپکنے پر صدف لب کھول دیتی ہے



زمانے ہم فقیروں پر زباں بندی نہیں چلتی
مُناسب سنگِ در ہو تو جبیں لب کھول دیتی ہے



اکثر اوقات نیم لبی کی کیفیت بھی نمایاں ہوئی ہے، اظہار میں آئرنی کا فن بھی اُجاگر ہوا ہے۔

پروفیسر عتیق اللہ۔ دہلی

اتنا محتاط کہ جنبش نہیں کرنے دے گا
عمر بھر ایک گذارش نہیں کرنے دے گا

اُس سے امید یہ کرتے ہو کہ سورج کا طواف
وہ تو محور پہ بھی گردش نہیں کرنے دے گا

دل ہی چاہے گا تو زنجیر کے ٹکڑے ہوں گے
اس سے پہلے کوئی کوشش نہیں کرنے دے گا

پار کرنے کے لئے آج بھی دریا کا بہاؤ
ایسا رکھے گا کہ خواہش نہیں کرنے دے گا

اب بھی سینے میں کہاں باغ اترنے والا
پانو دے جائے گا لغزش نہیں کرنے دے گا

،،مختلف ،، کے شاعر کے ردِّعمل میں انوکھا پن ہے، جو سطح سے نیچے پہنچ کر حقیقت کے وہ روپ دیکھتا۔
جو انسانی وجود پر براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں

ڈاکٹر محمد حسن عصری ادب دہلی۔

شام کے بعد ستاروں کو سنبھلنے نہ دیا
رات کو روک لیا چاندکو ڈھلنے نہ دیا

موجِ باطن کبھی اوقات سے باہر نہ گئی
حد کے اندر بھی کسی شے کو مچلنے نہ دیا

آگ تو چاروں ہی جانب تھی پہ اچھا یہ ہے
ہوش مندی سے کسی چیز کو جلنے نہ دیا

اب کے مختار نے محتاج کی دیوار کا قد
جتنا معمول ہے اُتنا بھی نکلنے نہ دیا

جن بزرگوں کی وراثت کے امیں ہیں ہم لوگ
اُنکی قبروں نے کبھی شہر بدلنے نہ دیا

انہیں زمین کو آسمان کے تناظر میں دیکھنا بھی آتا ہے اور یہ اندھے مفاہیم کو فنی اظہار کی بینائی بھی عطا کرتے ہیں۔

عبدالاحد ساز بمبئی

Scanned with CamScanner